جاوید احمد غامدی

قطعی الدلالۃ

قرآن قطعی الدلالۃ ہے۔ چنانچہ اُس کے مخاطبین جب اُس کے کسی دعوے کو نہیں مانتے تو پوری شان کے ساتھ کہتا ہے کہ 'اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّکَ فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِیْنَ'* (تمھارے پروردگار کی طرف سے یہی حق ہے، لہٰذا کسی شبہے میں نہ رہو)۔ اور انکار پر اصرار کریں تو اسی بنا پر اُنھیں یہ کہہ کر مباہلے کا چیلنج دے دیتا ہے کہ یہ 'العلم' ہے جو تمھارے پروردگار کی طرف سے آ گیا ہے۔ اِس کے مقابلے میں ہر چیز محض کذب و افترا یا ظن و گمان ہے اور حق کے مقابلے میں ظن کوئی حیثیت نہیں رکھتا: 'اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا'**۔

اُس کی یہی حیثیت آج بھی ہے۔ اِس لیے کہ اُس کے الفاظ جس تواتر کے ساتھ نقل ہوئے ہیں، اُن کے مفاہیم بھی اُسی طرح نقل کیے گئے ہیں۔ قرآن کے علما جس چیز میں اختلاف کرتے ہیں، وہ الفاظ کے مفاہیم نہیں، بلکہ کسی خاص موقع و محل کے لیے اُن مفاہیم میں سے کسی مفہوم کا انتخاب ہے۔ یہ مفاہیم کتابوں میں ثبت ہوئے ہیں، اِنھیں علما، فقہا، ادبا اور مفسرین نے جگہ جگہ بیان کیا ہے۔ یہ مسلمانوں کے مدرسوں، خانقاہوں اور علم و ادب کی مجالس میں پڑھے پڑھائے اور سمجھے سمجھائے گئے ہیں۔ زمانۂ رسالت سے لے کر آج تک یہ سلسلہ اِسی تواتر کے ساتھ جاری ہے، اِس میں کبھی کوئی انقطاع نہیں ہوا۔ یہی معاملہ اُس کی زبان کے قواعد و اسالیب کا ہے۔ اُنھیں بھی اِسی تواتر کے ساتھ نقل کیا گیا اور پڑھا اور پڑھایا گیا ہے۔ اِس میں شاذ اگر کوئی استثنا کہیں بیان کیا جا سکتا ہے تو اپنی دلالت سے

---

* آل عمران ۳: ۶۰۔

** آل عمران ۳: ۶۱-۶۳۔ النجم ۵۳: ۲۸۔

یہی متواترات اُس کو بھی درجۂ یقین میں لے آتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کے متعلق یہ بات آج بھی پورے اطمینان کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ انسان اُس کے الفاظ کی رہنمائی قبول کر لے تو وہ قطعیت کے ساتھ اُسے ٹھیک اُس مدعا تک پہنچا دیتے ہیں جس کے لیے استعمال کیے گئے ہیں۔

زبان کی نقل و روایت اور لفظ و معنی کے باہمی ربط سے متعلق جو مسائل لوگوں کے لیے اِس باب میں مزلۂ قدم ثابت ہوئے ہیں، اُن میں سے بعض کی غلطی ہم اپنی کتاب ''میزان'' کے مقدمے میں واضح کر چکے ہیں اور بعض پر کسی تبصرے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ سوفسطائی نظریات حیات و کائنات کی سنگین حقیقتوں کے مقابلے میں جس طرح اِس سے پہلے قصۂ پارینہ بنے ہیں، یہ نئی سوفسطائیت بھی عنقریب اِسی طرح قصۂ پارینہ بن جائے گی۔ اِس کی تردید و تغلیط میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ اِسی طرح بعض نئے قلم کاروں کی یہ بات بھی قابل توجہ نہیں ہے کہ عام قطعی الدلالۃ نہیں ہوتا اور قرآن کی زیادہ تر آیتیں چونکہ اِسی طرح کے الفاظ پر مشتمل ہیں، لہٰذا قرآن بھی قطعی الدلالۃ نہیں ہوسکتا۔ اہل علم خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بات کیسی طفلانہ اور علم و دانش سے کتنی بعید ہے۔ جس کے کہنے والے الفاظ کی وضع لغوی اور وضع استعمالی کا فرق بھی نہیں جانتے۔

ایک اعتراض، البتہ مستحق ہے کہ اُس سے تعرض کیا جائے۔ بعض علما کہتے ہیں کہ قرآن کی بیش تر آیات کے سمجھنے میں لوگوں نے اختلاف کیا ہے، اِس لیے وہ محتمل الوجوہ ہیں اور کوئی محتمل الوجوہ کلام قطعی الدلالۃ نہیں ہوسکتا۔ قطعی الدلالۃ اُسی کلام کو کہیں گے جس کی تاویل میں کوئی اختلاف نہ ہو۔

اِس اعتراض میں اتنی بات بالکل صحیح ہے کہ کوئی محتمل الوجوہ کلام قطعی الدلالۃ نہیں ہوسکتا، لیکن کیا ہر وہ کلام جس کی تاویل میں اختلافات ہوں، محتمل الوجوہ ہو جاتا ہے؟ ہمارا جواب ہے کہ ہرگز نہیں۔ محتمل الوجوہ ہونا کلام کی مستقل صفت ہے، یہ اُسے عارض نہیں ہوتی۔ آپ کسی کلام کو محتمل الوجوہ قرار دینا چاہتے ہیں تو ثابت کیجیے کہ اُس کی تاویل میں جو اختلافات بیان کیے جا رہے ہیں، وہ ہمیشہ سے قائم ہیں اور ہمیشہ قائم رہیں گے۔ علم و استدلال کسی حال میں اُس کے وجود سے اُنھیں منفک نہ کر سکیں گے۔ ایک شخص کسی کلام کو سنتا یا پڑھتا ہے اور اُس کے کسی لفظ، کسی محاورے یا کسی تالیف کے معنی غلط سمجھ لیتا ہے۔ دوسرا جملے کے دروبست کو نظر انداز کر کے اُس کا ایک مفہوم بیان کر دیتا ہے۔ تیسرا ہر جملے کو منفرد خیال کرتا ہے اور سیاق و سباق اور نظم کلام کی پروا کیے بغیر اُس کا ایک مدعا بیان کرتا ہے۔ کیا یہ سب وجوہ کلام ہیں اور اِن کی بنا پر اُسے محتمل الوجوہ کہا جائے گا؟ قرآن کی تاویل میں جتنے اختلافات ہوئے ہیں، سب کی

نوعیت یہی ہے۔ چنانچہ اُس کی کوئی ایک آیت بھی نہیں ہے جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اصلاً محتمل الوجوہ ہے اور سلف سے خلف تک تمام علما متفق رہے ہیں کہ اُس میں ایک سے زیادہ معنی کا احتمال ماننا ضروری ہے۔ اِس کے برخلاف صورت حال یہ ہے کہ جتنے اقوال کسی آیت کے بارے میں نقل ہوئے ہیں، اُن میں سے بعض اختیار کیے گئے اور بعض چھوڑ دیے گئے ہیں۔ پھر جو چھوڑ دیے گئے ہیں، اُنھیں دوسرے اہل علم نے اختیار کر لیا ہے اور جو اختیار کیے گئے ہیں، اُنھیں چھوڑ دیا ہے۔ علما اِس ترک و اختیار کے وجوہ بھی بیان کرتے ہیں۔ کہیں بتایا جاتا ہے کہ لغت اُس معنی کی تائید نہیں کرتی جو کسی قول میں اختیار کیے گئے تھے، کہیں تالیف کو سمجھنے کی غلطی واضح کی جاتی ہے، کہیں در و بست کو نظر انداز کرنے کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے اور کہیں سیاق و سباق اور نظم کلام سے استدلال کیا جاتا ہے۔ فقہ و کلام اور تفسیر کی کتابیں اِن مباحث سے بھری پڑی ہیں۔ ابن جریر لوگوں کے اقوال نقل کرنے میں سب سے زیادہ فیاض ہیں، لیکن تفسیر کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ جگہ جگہ مختلف اقوال پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ ابن کثیر اُنھی کا خلاصہ ہے، مگر یہ خلاصہ خود اصول ترجیح کی بنیاد پر کیا گیا ہے۔ زمخشری، قرطبی، آلوسی، طباطبائی، ابوالاعلیٰ مودودی، سب کی تفسیریں اِس کی شہادت دیتی ہیں۔ دنیا کی دسیوں زبانوں میں قرآن کے ترجمے ہوئے ہیں۔ اُنھیں دیکھ لیجیے کسی مترجم نے قرآن کی کسی ایک آیت کو بھی محتمل الوجوہ قرار دے کر اُس کا ترجمہ نہیں کیا، بلکہ ہر جگہ اپنی ترجیح قائم کی ہے اور اُسی کے مطابق ترجمہ کیا ہے۔ اِس کا منتہاے کمال امام فراہی کی تفاسیر اور استاذ امام امین احسن اصلاحی کی ''تدبر قرآن'' ہے، جن میں ترجمہ ہی نہیں، تفسیر میں بھی ہر جگہ ایک ہی قول کو ترجیح دی گئی ہے۔ اِس ترجیح سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے، مگر یہ اختلاف خود اِس بات کی دلیل ہوگا کہ اختلاف کرنے والا کلام کو محتمل الوجوہ نہیں مانتا۔ وہ اصرار کر رہا ہے کہ جو معنی سمجھے گئے ہیں، وہ فلاں اور فلاں وجوہ سے صحیح نہیں ہیں۔

لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ تاویل کے اختلافات اور کلام کے احتمالات میں فرق نہیں کرتے۔ یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ تاویل کے اختلافات قلت علم سے بھی پیدا ہو جاتے ہیں اور قلت تدبر سے بھی۔ پھر قلت تدبر کے بھی وجوہ ہیں۔ لوگوں کی ذہنی تربیت، اُن کی خواہشات، تعصّبات، عجلت پسندی، اشتغال بالا دنیٰ اور اِس نوعیت کی بہت سی چیزیں اِس کا باعث بن جاتی ہیں۔ اِن میں سے کوئی بات بھی نہ ہو تو قرآن جیسی مقدس کتاب کے بارے میں تنہا یہ احتیاط نقد و جرح سے گریز کا باعث بن جاتی ہے کہ معنی کی ترجیح میں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ اِس کے برخلاف کلام کے احتمالات اُس کی پیدایش کے وقت سے اُس میں ودیعت ہوتے ہیں۔ پڑھنے یا سننے والا اُنھیں دریافت کر لے تو

کبھی کلام سے الگ نہیں کرسکتا۔ چنانچہ وہ جب بیان کیے جاتے ہیں تو ہر شخص ماننے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ کلام کا پیدایشی عیب ہے، اِسے دور کرنا ممکن نہیں ہے۔

قرآن مجید اِس عیب سے بالکل مبرا ہے۔ اِس طرح کی کوئی چیز اُس کے بارے میں ثابت نہیں کی جا سکتی۔ وہ 'العلم' ہے، 'الحق' ہے، میزان اور فرقان ہے، عربی مبین میں نازل ہوا ہے، 'نذیرًا للعلمین' ہے، لہٰذا پوری دنیا کے لیے خدا کی حجت ہے۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ خدا کی کسی کتاب میں تضادات اور احتمالات نہیں ہوتے، وہ ہمیشہ قطعی الدلالۃ ہوتی ہے: 'لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا'*۔

---

* النساء ۴: ۸۲۔ ''اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اِس میں وہ بہت کچھ اختلاف پاتے۔''

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ الانعام

(۴)

(گذشتہ سے پیوستہ)

وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ، لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ
وَّلَا شَفِيْعٌ، لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٥١﴾
وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ، مَا عَلَيْكَ
مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ، وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ، فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ

(اِنھیں اب اِن کے حال پر چھوڑو) اور اِس (قرآن) کے ذریعے سے اُن لوگوں کو خبردار کرو جو اندیشہ رکھتے ہیں کہ اپنے پروردگار کے حضور میں اِس طرح پیش کیے جائیں گے کہ اُن کے لیے اُس کے سوا کوئی حامی اور کوئی سفارش کرنے والا نہ ہوگا تاکہ پرہیزگاری اختیار کریں[60]۔ ۵۱

(اِن کے ایمان کی آرزو میں) تم اُن لوگوں کو اپنے سے دور نہ کرو[61] جو صبح و شام اپنے پروردگار کو اُس کی خوشنودی کی طلب میں پکارتے ہیں۔ اِن کی ذمہ داری کا کوئی حصہ تم پر نہیں ہے اور نہ تمھاری

۶۰؎ اِس آیت سے تین باتیں واضح ہوتی ہیں۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

”ایک یہ کہ انذار کے لیے فطری اور عقلی چیز یہ قرآن ہے نہ کہ عذاب کی نشانیاں۔

دوسری یہ کہ یہ قرآن بھی نافع اُن لوگوں کے لیے ہے جن کے اندر فطرت کی صلاحیتیں زندہ ہیں۔ جن کی فطری

مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۵۲﴾ وَکَذٰلِکَ فَتَنَّا بَعۡضَھُمۡ بِبَعۡضٍ لِّیَقُوۡلُوۡۤا: اَھٰۤؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰہُ
عَلَیۡھِمۡ مِّنۡ بَیۡنِنَا، اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَعۡلَمَ بِالشّٰکِرِیۡنَ ﴿۵۳﴾ وَاِذَا جَآءَکَ الَّذِیۡنَ یُؤۡمِنُوۡنَ

ذمہ داری کا کوئی حصہ اِن پر ہے[۶۲] کہ (اِن کی خواہش پر) تم اُن لوگوں کو دور کر کے ظالموں میں شامل ہو جاؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اِسی طرح ایک کو دوسرے سے آزمایا ہے تاکہ یہ (بدبخت اُن غریبوں کو دیکھ کر) کہیں: کیا یہی لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہمارے درمیان سے اپنے فضل کے لیے چن لیا ہے؟[۶۳]

صلاحیتیں مردہ ہو چکی ہیں، اُن کو قرآن سے بھی نفع نہیں پہنچے گا۔

تیسری یہ کہ تقویٰ اور خداترسی کے لیے سب سے بڑا احجاب شفاعت باطل کا عقیدہ ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۵۸)

۶۱؎ اصل میں لفظ 'تَطۡرُدُ' آیا ہے۔ یہ معنی کے لحاظ سے ایک سخت لفظ ہے، لیکن سرداران قریش کی ذہنیت کو سامنے رکھ کر اِس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ اُن کی خواہش یہی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اُن ساتھیوں کو دھتکار دیں جو بالکل غربا اور عوام کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اِن غریبوں کے ساتھ بیٹھنا اُن کے شایان شان نہیں ہے۔ چنانچہ اُنھیں اراذل و اجلاف قرار دیتے اور کہتے تھے کہ اسلام اگر کوئی فضیلت کی چیز ہے تو اِس طرح کے لوگ اُس کے مستحق کیسے ہو سکتے ہیں۔ آیت میں روے سخن اِنھی مغروروں کی طرف ہے، لیکن بات اِن کو مخاطب کر کے کہنے کے بجاے پیغمبر کو مخاطب کر کے کہی گئی ہے، اِس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ بات اِس قابل بھی نہیں تھی کہ اِن کو مخاطب کر کے اِس کا جواب دیا جائے۔

۶۲؎ مطلب یہ ہے کہ اپنے اِس تکبر کے نتیجے میں یہ اگر جہنم کا ایندھن بنتے ہیں تو اِس کی کوئی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔ اِسی طرح اِن کے کہنے پر تم اگر اُن لوگوں کے حقوق تلف کرتے ہو جو تمھاری شفقت و محبت کے اصلی حق دار ہیں تو خدا کے حضور میں تمھاری طرف سے یہ اُس کے ذمہ دار نہیں ہو جائیں گے۔ خدا کا قانون یہی ہے کہ کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گی۔

۶۳؎ آیت میں 'لِیَقُوۡلُوۡا' آیا ہے۔ اِس میں لام عاقبت کا ہے جو علت کو نہیں، بلکہ نتیجے کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اُس سنت الٰہی کا بیان ہے جس کے تحت لوگوں کو موقع دیا جاتا ہے کہ اِس طرح کی باتیں کر کے اپنی بدبختی کا سامان کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا امتحان کے لیے بنائی ہے اور امتحان کے تقاضے سے یہ موقع دینا ضروری ہے۔

بِاٰیٰتِنَا، فَقُلْ: سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ، کَتَبَ رَبُّکُمْ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْکُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۵۴﴾ وَکَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ، وَلِتَسْتَبِیْنَ سَبِیْلُ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۵۵﴾

(اِن سے پوچھو)، کیا اللہ اپنے شکرگزار بندوں کو سب سے بڑھ کر نہیں جانتا؟[۶۴] (اِن کی خواہش کے برخلاف) ہماری آیتوں کو ماننے والے یہ لوگ جب تمھارے پاس آیا کریں تو اُن سے کہو کہ تم پر سلامتی ہو۔[۶۵] تمھارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت لازم کر رکھی ہے کہ تم میں سے اگر کوئی نادانی کے ساتھ برائی کا ارتکاب کر بیٹھے گا، پھر اِس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لے گا تو اللہ بخشنے والا ہے، بڑا مہربان ہے۔[۶۶] ہم اِسی طرح (اپنی) آیتوں کی تفصیل کرتے ہیں تاکہ (نیکوکاروں کی روش بھی نمایاں ہو) اور مجرموں نے جو راستہ اختیار کیا ہے، وہ بھی بالکل واضح ہو جائے۔[۶۷] ۵۲-۵۵

۶۴؎ یہ اُن کے تمرد کا جواب ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...مطلب یہ ہے کہ خدا کا دین سونا اور چاندی، ریشم اور مخمل نہیں ہے جس کی کاٹھی اور جس کے جھول گدھوں اور خچروں، گھوڑوں اور اونٹوں پر بھی نظر آ جاتے ہیں۔ یہ تو آسمانی نعمت اور یزدانی رحمت ہے جو صرف اُن کا حصہ ہے جو ہر حال میں اپنے رب کے شکرگزار رہے، جنھوں نے خدا کی نعمتوں کی قدر کی، جنھوں نے اپنی صلاحیتوں کا حق ادا کیا، جنھوں نے اپنے کان کھلے رکھے، جنھوں نے اپنی آنکھوں پر غرور کی پٹی نہیں باندھی اور جنھوں نے اپنے دلوں کو مردہ نہیں ہونے دیا۔ رہے وہ نابکار و ناشکرے لوگ جنھوں نے خدا کی بخشی ہوئی تمام ظاہری و باطنی نعمتوں کو خدا ہی کے خلاف استعمال کیا، اُن کے لیے اِس نعمت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ دنیا نیک و بد، دونوں کو مل جاتی ہے، لیکن دین کی نعمت صرف اُنھی کو ملتی ہے جو خدا کے شکرگزار ہوتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۳/۶۱)

۶۵؎ یہ جس طرح ملاقات یا رخصت کا کلمہ ہے، اُسی طرح خیرمقدم کا کلمہ بھی ہے۔ موقع کلام سے واضح ہے کہ یہاں اِسی دوسرے مقصد سے آیا ہے۔

۶۶؎ یہ بشارت بتا رہی ہے کہ جن لوگوں کو دی گئی، وہ مال و جاہ کے نہیں، بلکہ اُسی رحمت و مغفرت کے طلب گار تھے جس کا ذکر بشارت میں ہوا ہے۔ دنیا کے سروسامان سے اُن کو کوئی دل چسپی نہ تھی۔ اُن کے دل کی لگن یہی تھی کہ گناہ بخش دیے جائیں اور اُن کے پروردگار کی رضا اُنھیں حاصل ہو جائے۔

۶۷؎ اصل الفاظ ہیں: 'وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ'۔ اِس میں لام علت کا ہے اور اُس سے پہلے 'و' دلالت کر رہی ہے کہ 'لِتَسْتَبِيْنَ' کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

[باقی]

طالب محسن

سب سے بڑا گناہ

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ: سَأَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: أَيُّ الذَّنْبِ أَعْظَمُ عِنْدَ اللّٰهِ؟ قَالَ: أَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ. قَالَ: قُلْتُ لَهُ: إِنَّ ذٰلِكَ لَعَظِيْمٌ. قَالَ: قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: ثُمَّ أَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ مَخَافَةَ أَنْ يَّطْعَمَ مَعَكَ. قَالَ: قُلْتُ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: ثُمَّ أَنْ تُزَانِيَ حَلِيْلَةَ جَارِكَ.

حضرت عبداللہ (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کون سا گناہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا ہے؟ آپ نے فرمایا: یہ کہ تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھیرائے، جبکہ اس نے تمھیں پیدا کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں نے آپ سے عرض کی: یہ تو واقعی بڑا گناہ ہے۔ وہ کہتے ہیں: میں نے پوچھا: پھر کون سا؟ آپ نے فرمایا: تو اپنی اولاد کو اس اندیشے سے قتل کر دے کہ وہ تمھارے کھانے میں شریک ہو گی۔ وہ کہتے ہیں: میں نے پوچھا: پھر کون سا؟ آپ نے فرمایا: پھر یہ کہ تو اپنے ہمسائے کی بیوی کے ساتھ زنا کرے۔

قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ: قَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، أَيُّ الذَّنْبِ أَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ؟ قَالَ: أَنْ تَدْعُوَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ. قَالَ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: أَنْ تَقْتُلَ وَلَدَكَ

مَخَافَةَ أَنْ يَّطْعَمَ مَعَكَ. قَالَ: ثُمَّ أَيٌّ؟ قَالَ: أَنْ تُزَانِيَ حَلِيْلَةَ جَارِكَ، فَأَنْزَلَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ تَصْدِيْقَهَا: 'وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا'.

حضرت عبداللہ (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے پوچھا: یارسول اللہ، اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا کہ تو اللہ کا ہم سر ٹھہرائے، حالاں کہ اس نے تمھیں پیدا کیا ہے۔ اس نے پوچھا: پھر کون سا؟ آپ نے فرمایا کہ تو اپنی اولاد کو اس خوف سے مار دے کہ وہ تیرے ساتھ کھائے گی۔ اس نے پوچھا: پھر کون سا؟ آپ نے فرمایا: یہ کہ تو اپنے ہمسائے کی بیوی کے ساتھ زنا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے (الفرقان ۲۵: ۶۸ میں) آپ کے فرمان کی تصدیق بھی نازل فرما دی: ''وہ جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو نہیں پکارتے اور نہ کسی ایسی جان کو قتل کرتے ہیں جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے، مگر یہ کہ حق قائم ہو جائے اور نہ زنا کرتے ہیں اور جو یہ کرتے ہیں، وہ اپنے گناہوں کے انجام سے دوچار ہوں گے''۔

عَنْ أَبِيْ بَكْرَةَ قَالَ: كُنَّا عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِأَكْبَرِ الْكَبَائِرِ؟ ثَلَاثًا، اَلْإِشْرَاكُ بِاللّٰهِ، وَعُقُوْقُ الْوَالِدَيْنِ، وَشَهَادَةُ الزُّوْرِ أَوْ قَوْلُ الزُّوْرِ، وَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مُتَّكِئًا، فَجَلَسَ، فَمَا زَالَ يُكَرِّرُهَا حَتّٰى قُلْنَا: لَيْتَهُ سَكَتَ.

حضرت ابوبکرہ (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر تھے کہ آپ نے فرمایا: کیا میں تمھیں کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑے گناہ کے بارے میں نہ بتاؤں؟ (آپ نے یہ بات) تین مرتبہ (دہرائی)، اللہ کے ساتھ شرک، والدین کی حق تلفی اور جھوٹی گواہی یا

جھوٹی بات۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ٹیک لگائے ہوئے تھے، آپ بیٹھ گئے۔ آپ یہ بات دہراتے رہے، یہاں تک کہ ہمارے جی میں آنے لگا: آپ چپ ہو جائیں۔

عَنْ أَنَسٍ (رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ) عَنِ النَّبِيّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِی الْكَبَائِرِ، قَالَ: الشِّرْكُ بِاللّٰهِ، وَعُقُوقُ الْوَالِدَيْنِ، وَقَتْلُ النَّفْسِ، وَقَوْلُ الزُّوْرِ.

حضرت انس (رضی اللہ عنہ) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کبائر کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک، والدین کی حق تلفی، قتل نفس اور جھوٹی بات۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ (رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ) قَالَ: ذَكَرَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْكَبَائِرَ أَوْ سُئِلَ عَنِ الْكَبَائِرِ. فَقَالَ: الشِّرْكُ بِاللّٰهِ، وَقَتْلُ النَّفْسِ، وَعُقُوقُ الْوَالِدَيْنِ. وَقَالَ: أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِأَكْبَرِ الْكَبَائِرِ؟ قَالَ: قَوْلُ الزُّوْرِ أَوْ قَالَ: شَهَادَةُ الزُّوْرِ. قَالَ شُعْبَةُ: أَكْبَرُ ظَنِّی أَنَّهُ شَهَادَةُ الزُّوْرِ.

حضرت انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبائر کا ذکر کیا یا آپ سے کبائر کے بارے میں پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک، کسی جان کا قتل اور والدین کی حق تلفی۔ اور آپ نے فرمایا: میں تمھیں کبائر میں سے بھی سب سے بڑے گناہ کے بارے میں بتاؤں؟ آپ نے فرمایا: جھوٹی بات یا آپ نے کہا: جھوٹی گواہی۔ شعبہ کہتے ہیں کہ میرا غالب گمان یہ ہے کہ آپ نے فرمایا: جھوٹی گواہی۔

عَنْ أَبِی هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: اجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ. قِيلَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، وَمَا هُنَّ؟ قَالَ: الشِّرْكُ بِاللّٰهِ، وَالسِّحْرُ، وَقَتْلُ

النَّفسِ الَّتِی حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ، وَأَکْلُ مَالِ الیَتِیمِ، وَأَکْلُ الرِّبَا، وَالتَّوَلِّیْ یَوْمَ الزَّحْفِ، وَقَذْفُ الْمُحْصِنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ.

حضرت ابوہریرہ (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سات ہلاک کر دینے والی چیزوں سے بچو، پوچھا گیا: یارسول اللہ، وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک، جادو، کسی جان کو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے، اسے قتل کرنا، مگر یہ کہ حق قائم ہو جائے، یتیم کا مال کھا جانا، سود کھانا، جنگ کے دوران پیٹھ پھیرنا اور بھولی بھالی، مومن اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: إِنَّ مِنَ الْکَبَائِرِ شَتْمُ الرَّجُلِ وَالِدَیْہِ، قَالُوْا: یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ، وَھَلْ یَشْتِمُ الرَّجُلُ وَالِدَیْہِ؟ قَالَ: نَعَمْ، یَسُبُّ أَبَا الرَّجُلِ فَیَسُبُّ أَبَاہُ. وَیَسُبُّ أُمَّہُ فَیَسُبُّ أُمَّہُ.

عبداللہ بن عمرو بن عاص (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کبائر میں یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے والدین کو گالی دے۔ لوگوں نے پوچھا: یارسول اللہ، کیا کوئی آدمی اپنے والدین کو بھی گالی دیتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، آدمی دوسرے آدمی کے باپ کو گالی دیتا ہے اور (جواب میں) وہ اس کے باپ کو گالی دیتا ہے۔ اسی طرح آدمی دوسرے آدمی کی ماں کو گالی دیتا ہے اور (جواب میں) وہ اس کی ماں کو گالی دیتا ہے۔

لغوی مباحث

'حلیلۃ': 'حلیلۃ'، 'فعیلۃ' کے وزن پر 'حل' سے اسم صفت ہے، جس کا مطلب بیوی ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ 'حل' سے ہے، اس صورت میں یہ 'فاعلۃ' کے معنی میں ہے۔ ایک رائے یہ ہے کہ یہ 'حلول' سے ہے، یعنی یہ اس کے لیے حلال ہے اور یہ اس کے لیے حلال ہے۔

'عقوق الوالدین': والدین کا جو حق یا تعلق قائم ہوتا ہے، اس کو کاٹ دینا۔

معنی

اوپر درج روایات میں درج ذیل گناہوں کو کبیرہ گناہ قرار دیا گیا ہے:

۱۔ غیر اللہ کو اللہ کا شریک قرار دینا، جبکہ وہ خالق ہے،

۲۔ سحر،

۳۔ خوراک میں شرکت کے خوف سے اولاد کو قتل کرنا،

۴۔ ہمسائے کی بیوی سے زنا کرنا،

۵۔ کسی پاک دامن عورت پر الزام لگانا،

۶۔ والدین کی حق تلفی،

۷۔ یتیم کا مال کھانا،

۸۔ سودخوری،

۹۔ جھوٹی گواہی،

۱۰۔ قتل نفس،

۱۱۔ اپنے والدین کو گالی دینا،

۱۲۔ میدان جنگ سے بزدلانہ فرار۔

یہ فہرست دوسری روایات اور قرآن مجید کو سامنے رکھیں تو بالکل واضح ہے کہ مکمل نہیں ہے۔ کچھ جرائم اور بھی ہیں جنھیں اس فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ان روایات میں گناہوں کی ترتیب سے بھی کوئی حتمی معنی اخذ نہیں کیے جا سکتے، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ اس طرح کی روایات میں بالعموم راوی حضرات ترتیب بیان میں مختلف ہو جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خود مسلم ہی کے متون سے واضح ہے کہ ترتیب ایک نہیں ہے۔ راویوں کے تصرف سے اگر صرف نظر بھی کر لیا جائے تو اس سے زیادہ کچھ کہنا موزوں نہیں کہ ایک موقع کلام پر آپ نے کچھ پہلوؤں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک خاص ترتیب اختیار فرمائی۔ اس ترتیب میں مخاطب کی رعایت بھی ہو سکتی ہے اور معنوی ترتیب بھی۔ لہٰذا گناہ کی درجہ بندی میں ان روایات سے کوئی حتمی نتیجہ نکالنا موزوں نہیں ہے۔ اصلاً اس میں فیصلہ قرآن مجید ہی پر منحصر

ہے۔اس حوالے سے قرآن مجید کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقوق اللہ تعالیٰ کے ہوں یا انسانوں کے، ان کو تلف کرنا کبیرہ گناہ ہے۔ چنانچہ توحید خدا کا سب سے بڑا حق ہے، اس کی خلاف ورزی، یعنی شرک کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا گیا ہے اور قیامت کے دن اس کی معافی نہ ملنے کی وعید سنائی گئی ہے، پھر انسانوں کی جان، مال اور آبرو کے خلاف تعدی کو بھی بڑے جرم کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے اور ان کے ارتکاب پر دنیا اور آخرت میں سزا کا حکم سنایا ہے۔قرآن مجید سے کبیرہ گناہ کا یہی تصور ملتا ہے۔البتہ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ سرکشی اور اصرار بھی کسی گناہ کو کبیرہ بنا دیتے ہیں اور اس کے وہی نتائج نکل سکتے ہیں جو کبیرہ گناہ کے ہیں۔ دراں حالیکہ وہ گناہ اپنی نوعیت میں اتنا بڑا نہ ہو۔قرآن مجید سے ایک اور حقیقت بھی سمجھ میں آتی ہے کہ دین کے دفاع اور حمایت کا تقاضا جب سامنے آ جائے تو اس سے گریز و انحراف بھی ایک بڑا جرم ہے۔ان روایات میں ان تینوں ہی نوعیت کے جرائم کی بعض مثالیں بیان ہو گئی ہیں۔شرک کے بعد جرائم کی درجہ بندی مختلف پہلوؤں سے ہو سکتی ہے۔مثال کے طور پر اخلاقی شناعت کا پہلو، معاشرے میں اس کے اثرات کا پہلو، فرد کے انحراف کے درجے کا پہلو وغیرہ، لیکن ان روایات کی تفہیم میں اس تفصیل میں جانے کی کوئی افادیت نہیں ہے۔ بنیادی بات یہی ہے کہ خدا اور انسانوں کے حقوق کو تلف کرنا کبیرہ گناہ ہے اور شرک کا نتیجہ تو لازماً ابدی جہنم ہے اور باقی جرائم میں بھی اگر تلافی کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی تو ابدی جہنم کا امکان ہے۔

کبیرہ گناہ کا تصور قرآن مجید سے لیا گیا ہے۔عام گناہوں پر معافی ملنے کی نوید دیتے ہوئے ارشاد فرمایا ہے:

اِنۡ تَـجۡتَنِبُوۡا كَبٰٓئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّاٰتِكُمۡ وَنُدۡخِلۡكُمۡ مُّدۡخَلًا كَرِيۡمًا. (النساء۴:۳۱)

''اگر تم ان بڑے بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے رہو جن سے تمھیں روکا جا رہا ہے تو ہم تمھاری چھوٹی چھوٹی برائیاں تمھارے حساب سے ساقط کر دیں گے اور تمھیں عزت کی جگہ میں داخل کریں گے۔''

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کہ گناہ کا بڑا اور چھوٹا ہونا خدا اور بندوں کے حقوق کے پہلو سے بھی ہے، کرنے والے کے رویے کے پہلو سے بھی اور سماج پر اپنے اثرات کے پہلو سے بھی۔قرآن مجید کا سادہ مطالعہ بھی یہ بات واضح کر دیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کون سے جرائم بڑے جرائم شمار ہوتے ہیں۔خود انسانی فطرت میں بھی اس کا شعور موجود ہے اور وہ کسی گناہ کے بڑے یا چھوٹے ہونے کا ادراک بآسانی کر لیتی ہے۔قرآن مجید کی محولہ آیت یہ جاننے کی تحریک کا باعث بنی ہے کہ کبیرہ گناہ کیا ہیں؟ اس لیے کہ اس میں کبیرہ گناہوں سے بچنے کی صورت میں

بخشش اور نجات کی بڑی خوش خبری دی گئی ہے۔ کبیرہ گناہ کیا ہے؟ اس بات کو مختلف انداز میں بیان کیا گیا ہے، لیکن اس میں بنیادی باتیں وہی ہیں، جنھیں ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے۔

قرآن مجید میں نہ صرف یہ کہ دین کے اوامر ونواہی بیان ہوئے ہیں، بلکہ ان کی فضیلت و شناعت بھی زیر بحث آئی ہے۔ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کن احکام کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور کون سے احکام تفصیل یا فرع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل میں وہ بنیادی اخلاقی احکام بیان ہوئے ہیں جن پر عمل خدا کے دین کو اپنانے کا لازمی تقاضا ہے۔ اسی طرح سورۂ فرقان کی آخری آیات میں ایک سچے بندۂ مومن کی تصویر کھینچ کر دکھا دی گئی ہے۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے مقامات سے مومن مطلوب کی جو تصویر سامنے آتی ہے، اس سے ہم جان سکتے ہیں کہ جو اعمال اس تصویر سے جتنا زیادہ بعد رکھتے ہیں، وہ اتنے ہی زیادہ قبیح ہیں۔

قرآن مجید کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص کبیرہ گناہوں سے بچا رہے تو اس کی بخشش ہو جائے گی۔ یہ حقیقت میں خدا تعالیٰ کی رحمت کا اظہار ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے بندوں کے ساتھ سختی کا معاملہ نہیں کرنا، اصلاً رحمت اور شفقت کا معاملہ کرنا ہے۔ کبیرہ گناہوں سے بچنا صرف اسی صورت میں ممکن ہے، جب اصلاً کوئی شخص اپنی زندگی خدا خوفی کے اصول پر گزار رہا ہو۔ کبیرہ گناہوں کا ارتکاب ایک حد تک بے پروائی پر اترے بغیر ہو نہیں سکتا۔ یہی وہ چیز ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کے الگ ہونے کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ ان روایات کے مطالعے کا حاصل یہ ہے کہ یہ وہ جرائم ہیں جن کے ساتھ ایمان والی زندگی اور آخرت کی طرف دھیان کی نفی ہو جاتی ہے، لیکن اگر کوئی آدمی ان سے بچا ہوا ہے تو یہ اس بات کی نشانی ہے کہ وہ اصلاً بندگی کی زندگی گزار رہا ہے۔ یہی وہ شخص ہے جسے یہ خبر دی گئی ہے کہ اسے گناہوں اور کوتاہیوں کے باوجود خدا کی مغفرت حاصل ہو جائے گی۔

ان روایات میں شرک کو سب سے بڑا جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس کے بڑا جرم ہونے کو کئی پہلوؤں سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس پہلو کو یہاں نمایاں کیا ہے، وہ اس باب کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ جس ہستی نے تمام خلق کو عدم سے وجود بخشا ہو، اس ہستی کا ادراک کرنے کے بعد کسی اور کو الٰہ بنانا حماقت ہی نہیں، بلکہ اپنے خالق سے بغاوت بھی ہے۔ ان الفاظ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام شرک کرنے والوں کو اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ اللہ کو خالق ماننے کے بعد کسی اور کو الٰہ ماننا ممکن ہی نہیں ہے۔ فطرت اور عقل کی سادہ بساط پر بھی آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ خالق کے علاوہ کوئی اور الٰہ نہیں ہو سکتا، مگر دل چسپ بات یہ ہے کہ تمام مشرکین اللہ تعالیٰ کو خالق ماننے کے بعد ہی دوسری ہستیوں کو اس کی خدائی میں شریک مانتے ہیں۔ چنانچہ حضور نے اسی حقیقت کو نمایاں کرتے

ہوئے ارشاد فرمایا ہے کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ خالق کا شعور رکھنے کے باوجود کوئی شخص کسی دوسرے کو کار الوہیت میں شریک مانے۔

پہلی روایت میں دوسرا جرم تنگ دستی کے خوف سے قتل اولاد ہے۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ قتل ایک ایسا جرم ہے جو ابدی جہنم کا باعث بن سکتا ہے۔ کسی دوسرے انسان کی جان لینا ایک درجے کی شقاوت پر اترے بغیر ممکن نہیں ہے۔ پھر یہ کہ یہ شقاوت خود اپنی ہی اولاد کے خلاف نمایاں ہو تو یہ جرم کی شناعت کو اور بڑھا دیتی ہے۔ یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خوراک میں شریک ہونے کے الفاظ میں سبب بیان کیا ہے اور قرآن مجید میں یہی بات تنگ دستی کے اندیشے کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ یہ اس جرم کو دہرا جرم بنا دیتی ہے: ایک جرم یہ کہ اس نے ایک انسان کی جان لی جس کا اسے کوئی حق حاصل نہیں تھا۔ دوسرے یہ کہ اس کے رزق کے بارے میں اس زعم میں مبتلا ہوا کہ یہ اسی کے ناخن تدبیر پر منحصر ہے۔ آج جو کچھ حاصل ہے، اس میں اضافہ نہیں ہوگا اور اگر کل اس کی جدوجہد سے کچھ اضافہ بھی ہوا تو اس سے وہی فائدہ اٹھائے، کوئی دوسرا اس میں شریک کیوں ہو؟ یہاں تک کہ وہ اپنی اولاد کو بھی اس میں شریک کرنے کے لیے تیار نہیں۔ عام طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ عربوں کے بعض قبائل اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے، اس کی وجہ عورت کے ساتھ وابستہ ناموس کا مسئلہ بیان کی جاتی ہے۔ قرآن مجید اور اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مسئلہ معاشی تھا۔ یہ ممکن ہے کہ اسے بیان نہ کیا جاتا ہو اور معاشرے میں شاباش لینے کے لیے اسے غیرت کا مسئلہ بنا کر پیش کیا جاتا ہو۔

اس روایت میں تیسرا جرم ہمسائی کے ساتھ زنا بیان ہوا ہے۔ قرآن مجید میں زنا کو برا طریقہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح (بنی اسرائیل ۱۷: ۳۲ میں) زنا کے لیے 'فاحشة' کا لفظ بھی قرآن مجید میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا انسانی فطرت میں موجود حیا کے جذبے کی انتہائی خلاف ورزی ہے، اسی وجہ سے اسے کبیرہ گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اسی طرح یہ جرم اعلیٰ اخلاقی وصف وفا کے بھی خلاف ہے اور خاندانی زندگی جس اصول پر قائم ہے، اسے برباد کرتا ہے۔ خاندان اور معاشرہ رشتوں کے تقدس پر قائم ہے۔ اسی سے باہمی احترام اور اعتماد کی فضا قائم رہتی اور معاشرہ تعمیری سرگرمیوں اور تخلیقی نمو سے آراستہ نظر آتا ہے۔ ہمسائے کی بیوی کے ساتھ ناجائز تعلق جرم کی شناعت کے اسی پہلو کو بیان کرنے کے لیے بیان ہوا ہے۔ زنا بذات خود جرم ہے، لیکن اگر یہ اس طرح کیا جائے کہ باہمی رشتوں کے تقدس ہی کو پامال کر دے تو اس کی شناعت اور بڑھ جاتی ہے۔

دوسری روایت میں سورۂ فرقان کی اس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے، جس میں یہ تینوں جرائم بیان ہوئے ہیں۔ ہم

نے اوپر بیان کیا ہے کہ یہ آیت اصل میں اعلیٰ درجے کے بندۂ مومن کی صفات کا حسین مرقع پیش کرتی ہے۔ حوالہ دینے کا جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً حضور نے جب یہ باتیں بیان کیں تو خدا کی طرف سے یہ آیت اس کی تصدیق میں نازل ہوئی۔ ہمارے نزدیک بیان کرنے والے کی مراد صرف یہ ہے کہ یہی بات قرآن میں بھی بیان ہوئی ہے۔ روایات کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ بالعموم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فہم قرآن ہی کا بیان ہوتی ہیں۔

اگلی روایت میں والدین کی حق تلفی اور جھوٹی گواہی کو بڑے جرائم کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ قرآن مجید نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کے لیے احسان کی تعبیر اختیار کی ہے۔ احسان کا تقریباً وہی مطلب ہے جو اردو کے لفظ حسن سلوک سے ہم ادا کرتے ہیں۔ اس لفظ سے والدین کے ساتھ تعلق کے حدود طے ہو جاتے ہیں۔ ان کا کہنا ماننا، ان کی خدمت کرنا، ان کے آگے سر نہ اٹھانا، زبان سے گستاخی نہ کرنا، اپنا مال ان پر خرچ کرنا اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے سرگرم رہنا، حسن سلوک ہی کے مختلف مظاہر ہیں۔ یہی والدین کا حق ہے اور اس کی خلاف ورزی والدین کے حق کو نہ ماننا ہے۔ 'عقوق' کے لفظ سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ یہاں محض خلاف ورزی ہونا مراد نہیں ہے، بلکہ ارادے کے ساتھ والدین کے حق سے دست برداری مراد ہے۔

جھوٹی شہادت بھی ایک بڑا گناہ ہے۔ دنیا میں نظام عدل کا سارا انحصار قرائن و شواہد یا گواہی پر ہے۔ جھوٹی گواہی کا مطلب یہ ہے کہ انسان نے کسی کے جان، مال اور آبرو کی حفاظت کا جو بندوبست معاشرے میں موجود ہے، اس کو برباد کر دیا ہے۔ قرآن مجید نے جان، مال اور آبرو کے خلاف تعدی کو دنیا میں بھی قابل سزا جرم قرار دیا ہے اور آخرت میں بھی ان کی سزا جہنم بیان کی ہے۔ دنیا میں اشرار سے جان، مال اور آبرو کی حفاظت کا ایک ذریعہ عدل کا نظام ہے جو ہر معاشرہ اپنے حالات کے مطابق تشکیل دیتا ہے۔ سچی شہادت اس نظام کو صحت پر قائم رکھنے کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ جو آدمی جھوٹی گواہی دیتا ہے، وہ نہ صرف یہ کہ جھوٹ بولتا ہے، بلکہ جان، مال اور آبرو کے خلاف اس تعدی میں بھی شریک ہو جاتا ہے جو کسی دوسرے نے کی ہے اور یہ جھوٹ بول کر حق دار کا حق اسے ملنے کی راہ میں رکاوٹ بن گیا ہے۔

'سبع موبقات' والی روایت میں 'موبقات' کے لفظ سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ یہ وہ اعمال ہیں جو نیکیوں کو اکارت کر دیں گے۔ شارحین نے اس لفظ کو بالعموم مہلکات کے لفظ سے کھولا ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہ وہ اعمال ہیں جو ہلاکت میں ڈالنے والے ہیں۔ یہ ہلاکت اصلاً اخروی ہے، لیکن ان اعمال کا جائزہ لیں تو ان کے دنیوی نتائج بھی کم

مہلک نہیں ہیں۔ شرک کے بارے میں ہم بات کر چکے ہیں۔ شرک کے بعد جادو کا ذکر ہے۔ جادو کا ایک پہلو شیطانی قوتوں کے ساتھ ربط و تعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ شیطانی قوتیں کسی شخص کو خدا کی بندگی پر کیسے رہنے دے سکتی ہیں۔ قرآن مجید نے جادو کو کفر کہا ہے۔ مزید یہ کہ اپنے ایک پیغمبر، یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام سے اس کے کسی تعلق کی شدت کے ساتھ نفی کی ہے۔ ان دونوں باتوں کا مطلب یہ ہے کہ جادو اصل میں خدا سے دوری پر منتج ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نافرمانی کی زندگی اختیار کیے بغیر اس کو اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے فنون سے اشتغال رکھنے والے بالعموم منفی قسم کی سرگرمیوں ہی میں غلطاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا دوسرا پہلو دنیا کی زندگی کے بارے میں صائب رویے سے ہٹ جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری زندگی کو اصل میں محنت اور تدبیر کے اصول پر استوار کیا ہے۔ اس طرح کے فنون سے دل چسپی انسان کو توہم پرست بھی بنا دیتی ہے اور سعی و جہد کے راستے سے ہٹا کر ٹونوں اور ٹوٹکوں کا پجاری بھی بنا دیتی ہے۔ یہ چیز نہ صرف یہ کہ آخرت کے لیے سخت نقصان دہ ہے، بلکہ دنیا کی بربادی کا ذریعہ بھی ہے۔

قتل نفس کی شناعت پر ہم پہلے بات کر چکے ہیں۔ اس کے بعد یتیم کا مال کھانے کی برائی کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں یتیم کے مال کے حوالے سے بڑی تفصیل سے احکام دیے گئے ہیں۔ وراثت کی تقسیم کا موقع ہو یا آپ کسی کے مال کے ذمہ دار ہوں، ہر حال میں لوگوں کے حق کی حفاظت ضروری ہے۔ بطور خاص وہ لوگ جو اپنے حق کی حفاظت کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یتیم اس کی سب سے نمایاں مثال ہے، یعنی یہ وہ مظلوم ہے جو اپنا حق چھیننے والے کا ہاتھ کسی طور نہیں روک سکتا۔ یہ صرف حق دینے والے ہیں جو اگر انصاف کریں تو اس کا حق محفوظ رہ سکتا ہے۔ کسی یتیم کا حق مارنا صرف مالی بددیانتی ہی نہیں ہے، بلکہ ایک بچے کی زندگی کو عذابوں میں مبتلا کرنا بھی ہے۔ یہی چیز ہے جس کے باعث یہ جرم بہت زیادہ شنیع ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ معاشرے کے بے کس عناصر پر کی گئی تعدی بھی اسی قبیل کا جرم ہے اور اس طرح کے لوگ آخرت میں کبیرہ گناہ کے مرتکب ہی قرار دیے جائیں گے۔

سودخوری کو قرآن مجید میں بڑا جرم قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی اصل میں اکل اموال بالباطل کی قبیل کی چیز ہے، لیکن اس کی شناعت اس لیے زیادہ ہے کہ بحیثیت مجموعی معاشرے میں معاشی انصاف کے روبہ عمل ہونے کے قدرتی عوامل کی راہ کو مسدود کر دیتا ہے، یعنی سودخوری صرف ایک فرد کے مال پر دست درازی نہیں ہے، بلکہ معاشرے کے خلاف جرم ہے۔

مقابلے کے وقت پیٹھ دکھانا، اس جملے کا تعلق اسلامی جہاد سے ہے۔ جہاد بھی وہ جسے خدا کے پیغمبر نے اسلامی

جہاد قرار دیا ہے اور جس کے بارے میں بغیر کسی اشتباہ کے یہ یقین ہے کہ وہ صرف اور صرف اعلاے کلمۃ اللہ کے لیے ہے اور اس میں کوئی اور محرک موجود نہیں ہے۔ پھر اس جہاد کو کرنے کے لیے کوئی فضا پیدا نہیں کی گئی، دین کے دشمنوں نے پر امن دعوتی جدوجہد کو قتال کے راستے پر ڈالا ہے اور دشمن خود دین کو ختم کرنے کے لیے مسلح ہو کر آیا ہے۔ اس موقع پر مڈبھیڑ سے گریز درحقیقت دین کے دشمنوں کا ساتھ دینا ہے۔ یہی چیز ہے جسے واضح کرنے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے موبقات میں سے قرار دیا ہے۔

اس روایت کی آخری چیز کسی پاک دامن بھولی بھالی عورت پر تہمت لگانا ہے۔ عورت کی جو صفات یہاں بیان ہوئی ہیں، وہ جرم کی شناعت کو واضح کرنے کے لیے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ کسی عورت پر الزام لگانے کے لیے اسلام نے چار گواہوں کی شرط عائد کی ہے۔ یہ شرط لگانے سے مقصود یہ ہے کہ شریف زادیوں کی عصمت کی حفاظت ہو اور انھیں خواہ مخواہ بدنام کرنے کا موقع کسی کو حاصل نہ ہو۔ اگر کوئی شخص جانتے بوجھتے کسی شریف زادی پر تہمت لگاتا ہے تو اس نے حقیقت میں ایک عورت کی زندگی اجیرن کر دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہی چیز ہے جو اس جرم کو زیادہ شنیع بناتی ہے۔

اس سلسلے کی آخری روایت وہ ہے جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے والدین کو گالی دینے کو کبیرہ گناہ قرار دیا ہے۔ والدین کے حوالے سے اصل تقاضا کیا ہے؟ اسے ہم نے اوپر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ قرآن مجید نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دینے میں بعض نازک پہلوؤں کو بھی بیان کیا ہے۔ قرآن مجید کہتا ہے کہ والدین کے ساتھ بدتمیزی نہیں ہونی چاہیے، یہاں تک کہ ناگواری کا اظہار بھی نہیں ہونا چاہیے۔ جب قرآن مجید میں والدین کا احترام اس درجے میں مطلوب ہے تو گالی دینا واضح طور پر ایک بڑا جرم قرار پاتا ہے۔ یہاں روایت میں ایک اور پہلو بھی بیان ہوا ہے۔ ایسے کم بخت بہت کم ہوتے ہیں جو اپنے والدین کو گالی دیں۔ چنانچہ سننے والے کو یقین نہیں آیا کہ کوئی شخص اپنے والدین کو گالی دے سکتا ہے۔ حضور نے اس امکان کو بیان کرنے کے بجاے کہ ایسے بدبخت بھی ہو سکتے ہیں، گالی دینے کی ایک دوسری صورت کو بیان کر دیا۔ یہ وہ صورت ہے جو عام طور پر معاشرے میں معمول بہ نظر آتی ہے۔ حضور نے واضح کیا کہ دوسرے کو گالی دینا بھی حقیقت میں اپنے والدین کو گالی دینا ہے، اس لیے کہ جب کسی دوسرے کو گالی دی جائے گی تو جواب میں دی گئی گالی اسی شخص کی طرف لوٹ رہی ہے۔ اگرچہ اس نے خود تو اپنے والدین کو گالی نہیں دی، مگر دوسرے کو گالی دے کر اپنے والدین کو گالی دینے کا بندوبست کر دیا ہے۔ والدین کو گالی دینا ایک جرم ہے۔ یہ جرم کم نہیں ہوتا، اگرچہ انسان دوسرے کے والدین کو گالی دے رہا ہو۔

متون

زیرنظر مضمون پانچ روایتوں کی شرح پر مشتمل ہے۔ان روایتوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کبائر کا بیان نقل ہوا ہے۔ اگرچہ محل اوراجزاے بیان میں فرق ہے،لیکن بات چونکہ ایک ہی نوعیت کی ہے،اس لیے ہم نے ان روایات کوایک ہی مضمون کا حصہ بنادیا ہے۔

جس روایت میں والدین کو گالی دینے کی بات بیان ہوئی ہے،اس روایت کے زیادہ متون کتب حدیث میں موجودنہیں ہیں۔چنانچہ اس میں میرے سامنے جومتون موجود ہیں،ان میں کوئی اختلاف مذکورنہیں ہے۔اسی طرح 'سبع موبقات' والی روایت میں بھی کم وبیش ایک ہی متن تمام کتب میں منقول ہے،صرف ایک جگہ پر ایک اختلاف منقول ہےاوروہ یہ ہے کہ اس میں 'سحر' کی جگہ 'الشح' کا لفظ آیا ہے،لیکن یہ اختلاف محل نظر ہے۔سحر کا کبیرہ گناہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے،لیکن 'الشح' کا کبیرہ گناہ ہونا کافی مشکل نظر آتا ہے۔

وہ روایت جس کا آغاز 'ألا أنبئكم بأكبر الكبائر؟' کے الفاظ سے ہوا ہے،اس میں بھی زیادہ تر اختلافات لفظی ہی ہیں۔البتہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا تھا:

عن رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم قال: أرأیتم الزاني والسارق و شارب الخمر؟ ماترون فیهم؟ فقالوا: ألله ورسوله أعلم، قال هن فواحش وفیهن عقوبة. ثم قال: ألا أنبئكم بأكبر الكبائر؟...
(مسند اسحاق بن راہویہ، رقم ۴۴۴)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم زانی، چوراورشراب پینے والے کودیکھتے ہو؟ تمھاری ان کے بارے میں کیا راے ہے؟ لوگوں نے کہا: اللہ اوراس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں، آپ نے فرمایا: یہ فواحش ہیں اوران پرسزا بھی ہے۔ پھر آپ نے فرمایا: کیا میں کبیرہ گناہوں سے بھی بڑے گناہ کے بارے میں نہ بتاؤں؟...''

وہ روایت جس میں کبائر کے متعلق حضور سے سوال سے بات شروع ہوئی ہے، وہ کئی کتابوں میں آئی ہے۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر جملہ تمام ممکن اسالیب میں بیان ہوگیا ہے۔نمایاں اختلاف ترتیب کے فرق اورسوال کے حضرت عبداللہ سے نسبت اورعدم نسبت کا ہے۔

کتابیات

مسلم، رقم ۸۶- ۹۰؛ بخاری، رقم ۲۵۱۰، ۲۵۱۱، ۲۶۱۵، ۴۲۰۷، ۴۴۸۳، ۵۶۳۱، ۵۶۳۲، ۵۶۵۵، ۵۹۱۸،

۶۲۹۸، ۶۴۲۶، ۶۴۶۵، ۶۴۶۸، ۶۴۷۶، ۶۴۷۷، ۶۵۲۱، ۷۰۸۲، ۷۰۹۴؛ ابوداؤد، رقم ۲۳۱۰، ۲۸۷۴، ۲۸۷۵؛ ترمذی، رقم ۱۲۰۷، ۱۹۰۱، ۲۳۰۱، ۳۰۱۸ - ۳۰۲۱، ۳۱۸۲، ۳۱۸۳؛ نسائی، رقم ۳۶۷۱، ۴۰۱۰، ۴۰۱۱، ۴۰۱۳ - ۴۰۱۵، ۴۸۶۷، ۴۸۶۸؛ مسند طیالسی، رقم ۲۶۴؛ مصنف عبدالرزاق، رقم ۱۹۷۰۴، ۱۹۷۰۵، ۱۹۷۰۷، ۱۹۷۱۹؛ مسند حمیدی، رقم ۱۰۳۔ مسند ابن الجعد، رقم ۳۳۰۳؛ مسند اسحاق بن راہویہ، رقم ۴۴۴؛ احمد، رقم ۳۶۱۲، ۳۸۱۱، ۴۱۰۲، ۴۱۳۱، ۴۱۳۲، ۴۱۳۴، ۴۴۱۱، ۴۴۲۳، ۱۲۳۵۸، ۲۰۴۰۱، ۲۰۴۱۰؛ الادب المفرد، رقم ۸، ۳۰؛ خلق افعال العباد، رقم ۳۴۶، ۳۴۸؛ مسند حارث، رقم ۲۹؛ السنن الکبریٰ، رقم ۳۴۷۳، ۳۴۷۶ - ۳۴۷۸، ۶۰۲۲، ۶۴۹۸، ۷۱۲۴، ۷۱۲۵، ۱۰۹۸۷، ۱۱۰۹۹، ۱۱۱۰۱، ۱۱۳۶۱، ۱۱۶۳۸، ۱۱۳۶۹؛ مسند ابویعلیٰ، رقم ۵۰۹۸، ۵۱۳۰، ۵۱۶۷؛ ابن حبان، رقم ۴۴۱۴ - ۴۴۱۶، ۵۵۶۱، ۵۵۶۳؛ مسند شامیین، رقم ۲۳۷۵، ۲۶۳۵؛ المعجم الکبیر، رقم ۱۰۲، ۱۶۵، ۵۶۳۶، ۹۸۱۹، ۹۸۲۰، ۱۳۰۲۳؛ مستدرک، رقم ۱۹۷، ۷۶۶۶، ۷۸۰۸؛ بیہقی، رقم ۶۵۱۴، ۶۵۱۵، ۱۲۴۴۷، ۱۵۶۰۰، ۱۵۶۰۱، ۱۵۶۱۷ - ۱۵۶۱۹، ۱۵۶۲۹، ۱۶۹۰۵، ۱۷۸۵۶، ۲۰۱۶۷، ۲۰۳۶۵۔

محمد عمار خان ناصر

عہد نبوی میں جہاد وقتال کی نوعیت

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ مجھے امید ہے کہ آپ میری دی ہوئی امان کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ آپ نے فرمایا: انت تقول ذلك يا ابا سفيان (واقدی، المغازی ۲/ ۷۹۴) ''ابوسفیان، یہ بات تم کہہ رہے ہو (مجھ پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں)''۔ اس کے بعد ابوسفیان ناکام مکہ واپس لوٹ آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بعد صحابہ کو خفیہ طور پر تیاری کا حکم دیا اور اسی رازداری کی کیفیت میں حملہ آور ہو کر مکہ کو فتح کر لیا اور بیت اللہ کو تمام اصنام واوثان اور مشرکانہ رسوم کے تمام آثار سے پاک کر کے اس کو دین ابراہیمی کی اصل اساس یعنی توحید کے عالمی مرکز کی حیثیت سے بحال کر دیا۔

۹ ہجری میں حج کے موقع پر قرآن نے یہ اعلان کیا کہ مشرکین اپنی اعتقادی نجاست کی وجہ سے بیت اللہ میں عبادت تو کجا، اس کے قریب آنے کے حقدار بھی نہیں ہیں، اس لیے اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب بھی پھٹکنے نہ پائیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَذَا (التوبہ ۲۸)

''اے ایمان والو! مشرکین محض ناپاک ہیں، اس لیے اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب نہ آنے پائیں۔''

چنانچہ اس سال حج کے موقع پر اس حکم کی باقاعدہ منادی کر کے حرم میں مشرکین کے داخلے پر پابندی عائد کر دی

گئی۔ (بخاری) ۱۰ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے لیے مکہ مکرمہ میں تشریف لائے اور دین ابراہیمی کی روایات کے مطابق مناسک حج کی تعلیم لوگوں کو دی۔ (مسلم، رقم: ۲۹۵۰) اس طرح کفر وشرک سے بیت اللہ کی تطہیر اور اس کو توحید کا عالمی مرکز بنانے کا مشن مکمل ہو گیا، چنانچہ آپ نے اس موقع پر یہ اعلان فرمایا کہ:

ان الشیطان قد ایس من ان یعبد فی بلادکم ھذہ ابدا۔

''شیطان کو اب اس بات کی کوئی امید نہیں رہی کہ جزیرۃ العرب میں دوبارہ کبھی اس کی پوجا کی جائے گی۔''

(ترمذی، رقم ۳۰۸۵)

بیت اللہ میں دین توحید کی بحالی کے بعد اگلا مرحلہ شرک اور مظاہر شرک سے سرزمین عرب کی تطہیر کا تھا۔ یہ دراصل اسی ذمہ داری کا تسلسل تھا جو ذریت ابراہیم پر اپنی میراث کے علاقے کو شرک سے پاک رکھنے کے لیے ابتدا ہی سے عائد کی گئی تھی۔ چنانچہ بنی اسرائیل جب مصریوں کی غلامی سے رہا ہو کر سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں ایک گروہ کی حیثیت سے منظم ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں حکم دیا کہ وہ سرزمین کنعان پر قبضہ کرنے کے لیے، جس کی ملکیت اور وراثت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ان کی ذریت کے حق میں کیا تھا، اس شہر کے باشندوں کے خلاف قتال کریں اور شہر پر قبضہ کر لیں۔ (المائدہ ۲۰، ۲۱) تورات میں ہے کہ اس وقت سرزمین کنعان میں بہت سی مشرک قومیں آباد تھیں اور بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ ان سب قوموں کو نیست و نابود کر کے ان کی عبادت گاہوں اور بتوں کو ڈھا دیں اور اس سرزمین سے کفر وشرک کا خاتمہ کر دیں۔ کتاب گنتی میں ہے:

''جب تم اردن سے پار ہو کر ملک کنعان میں جاؤ تو اس ملک کے سب باشندوں کو اپنے سامنے سے نکال دو۔ ان کی سب تراشی ہوئی مورتوں کو اور ان کے گھڑے ہوئے بتوں کو فنا کر و اور ان کی اونچی جگہوں کو ڈھا دو اور ملک کے مالک بنو اور اس میں بسو، کیونکہ میں نے تمھیں اس کو بطور میراث کے دیا ہے۔'' (۳۳: ۵۰۔۵۳)

استثنا میں ہے:

''جب خداوند تیرا خدا تجھ کو اس ملک میں جس پر قبضہ کرنے کے لیے تو جا رہا ہے پہنچا دے اور تیرے آگے سے ان بہت سی قوموں کو یعنی حتیوں اور جرجاسیوں اور اموریوں اور کنعانیوں اور فرزیوں اور حویوں اور یبوسیوں کو جو ساتوں قومیں تجھ سے بڑی اور زور آور ہیں نکال دے اور جب خداوند تیرا خدا ان کو تیرے آگے شکست دلائے اور تو ان کو مارلے تو تو ان کو بالکل نابود کر ڈالنا۔ تو ان سے کوئی عہد نہ باندھنا اور نہ ان پر رحم کرنا۔ تو ان سے بیاہ شادی بھی نہ کرنا۔ نہ ان کے بیٹوں کو اپنی بیٹیاں دینا اور نہ اپنے بیٹوں کے لیے ان کی بیٹیاں لینا کیونکہ وہ تیرے بیٹوں کو میری پیروی سے برگشتہ کر دیں گے تا کہ وہ اور معبودوں کی عبادت کریں۔ یوں خداوند کا غضب تم پر بھڑکے گا اور وہ تجھ کو

جلد ہلاک کر دے گا۔ بلکہ تم ان سے یہ سلوک کرنا کہ ان کے مذبحوں کو ڈھا دینا۔ ان کے ستونوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینا اور ان کی یسیرتوں کو کاٹ ڈالنا اور ان کی تراشی ہوئی مورتیں آگ میں جلا دینا۔'' (استثناء ۷: ۱۔۵)

تورات کے مطابق بنی اسرائیل کو اس کا پابند کیا گیا تھا کہ وہ اپنی میراث کے علاقے سے باہر بسنے والی اقوام کے ساتھ صلح کا معاہدہ کر سکتے ہیں، لیکن میراث کے حدود کے اندر وہ کسی مشرک قوم کا وجود گوارا نہ کریں:

''جب تو کسی شہر سے جنگ کرنے کو اس کے نزدیک پہنچے تو پہلے اسے صلح کا پیغام دے اور اگر وہ تجھ کو صلح کا جواب دے اور اپنے پھاٹک تیرے لیے کھول دے تو وہاں کے سب باشندے تیرے باج گزار بن کر تیری خدمت کریں۔..... ان سب شہروں کا یہی حال کرنا جو تجھ سے بہت دور ہیں اور ان قوموں کے شہر نہیں ہیں۔ پر ان قوموں کے شہروں میں جن کو خداوند تیرا خدا میراث کے طور پر تجھ کو دیتا ہے، کسی ذی نفس کو جیتا نہ بچا رکھنا بلکہ تو ان کو یعنی حتی اور اموری اور کنعانی اور فرزی اور حوی اور یبوسی قوموں کو جیسا کہ خداوند تیرے خدا نے تجھ کو حکم دیا ہے، بالکل نیست کر دینا تاکہ وہ تم کو اپنے سے مکروہ کام کرنے نہ سکھائیں جو انھوں نے اپنے دیوتاؤں کے لیے کیے ہیں اور یوں تم خداوند اپنے خدا کے خلاف گناہ کرنے لگو۔'' (استثنا ۲۰: ۱۰۔۱۸)

بنی اسرائیل ہی کے ایک عظیم پیغمبر اور فرمانروا سیدنا سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بے نظیر حکومت وسلطنت، مادی واقتصادی قوت اور شاہانہ شان وشوکت سے نوازا تھا۔ قرآن مجید کی تصریح کے مطابق سیدنا سلیمان علیہ السلام نے اپنی اس قوت اور برتری کو اپنے قرب وجوار میں مشرکانہ مذاہب کی پیروی کرنے والی قوموں کی تادیب وتنبیہ اور ان کو سرنگوں کرنے کے لیے بھی استعمال کیا۔ چنانچہ جب انھیں معلوم ہوا کہ قوم سبا سورج پرستی میں مبتلا ہے تو انھوں نے اس کی ملکہ کو خط لکھا:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ اَلَّا تَعۡلُوۡا عَلَیَّ وَاۡتُوۡنِیۡ مُسۡلِمِیۡنَ۔ (النمل ۳۱)

''اللہ کے نام کے ساتھ جس کی رحمت بے پایاں اور جس کی شفقت ابدی ہے۔ میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور فرماں بردار بن کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔''

ملکہ سبا کی طرف سے پس وپیش کیے جانے پر انھوں نے انھیں دھمکی دی کہ:

فَلَنَاۡتِیَنَّہُمۡ بِجُنُوۡدٍ لَّا قِبَلَ لَہُمۡ بِہَا وَلَنُخۡرِجَنَّہُمۡ مِّنۡہَاۤ اَذِلَّۃً وَّہُمۡ صٰغِرُوۡنَ (النمل ۳۷)

''پس ہم ایسے لشکروں کے ساتھ ان پر حملہ کریں گے جن کا مقابلہ کرنے کی تاب ان میں نہیں ہوگی اور ہم ان کو ذلیل اور حقیر بنا کر ان کے ملک سے نکال دیں گے۔''

اسی قانون کے تحت خود بنی اسرائیل کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے یہ سزا مقرر کر دی تھی کہ اگر ان میں سے کوئی فرد یا گروہ 'شرک' یا اس کے مظاہر میں مبتلا ہو تو اسے قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر جانے کے بعد جب بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا کہ جو لوگ اس نجاست سے آلودہ نہیں ہوئے، وہ بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کو قتل کریں:

وَإِذْ قَالَ مُوسَى لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوبُواْ إِلَى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُواْ أَنفُسَكُمْ ذَلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ (البقرہ ۵۴)

''اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم، تم نے بچھڑے کو معبود بنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اس لیے اپنے پیدا کرنے والے کی طرف توبہ کرو اور اپنے (بھائی بندوں) کو قتل کرو۔ یہ تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے لیے بہتر ہے۔''

اسی قانون کے تحت موسوی شریعت میں مشرکانہ اعمال ورسوم میں ملوث ہونے والوں کے لیے موت کی سزا مقرر کی گئی تھی۔ تورات میں ہے:

''پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا تو بنی اسرائیل سے یہ بھی کہہ دے کہ بنی اسرائیل میں سے یا ان پردیسیوں میں سے جو اسرائیلیوں کے درمیان بود و باش کرتے ہیں، جو کوئی شخص اپنی اولاد میں سے کسی کو مولک کی نذر کرے، وہ ضرور جان سے مارا جائے۔ اہل ملک اسے سنگسار کریں۔'' (احبار ۲۰: ۱، ۲)

بنی اسرائیل میں سلسلہ نبوت کے اختتام کے بعد بنی اسماعیل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت چونکہ ذریت ابراہیم ہی میں چلی آنے والی روایت کا تسلسل تھی، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد جزیرۂ عرب میں 'شرک' کے بطور ایک مذہب اور مشرکین کے بطور ایک مذہبی گروہ کے باقی رہنے کی کوئی گنجایش نہیں ہو سکتی تھی اور مشرکین اگر اپنے کفر و شرک پر قائم رہتے تو ان پر موت کی سزا کا نافذ کیا جانا خدا کے قانون کے مطابق بعثت محمدی کا ایک لازمی تقاضا تھا۔ اس ضمن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بنیادی اقدام تو یہ کیا کہ مختلف مواقع پر باقاعدہ مہمات بھیج کر جزیرۂ عرب میں مختلف مقامات پر قائم مشرکین کے عبادت خانوں کو مسمار کروا دیا۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

قریش اور بنو کنانہ نے نخلہ کے مقام پر عزیٰ کی عبادت گاہ قائم کر رکھی تھی اور اس کی تولیت و دربانی کی ذمہ داری بنو ہاشم کے حلیف قبیلہ سلیم کے خاندان بنو شیبان کے پاس تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن الولید کو بھیج کر اس کو منہدم کرا دیا۔

بنوثقیف نے طائف میں لات کی عبادت گاہ بنا رکھی تھی اور اس کے متولی اور خادم بنومعتب تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مغیرہ بن شعبہ اور ابوسفیان صخر بن حرب کو بھیجا جنھوں نے اس کو گرا کر یہاں ایک مسجد بنا دی۔

اوس اور خزرج اور یثرب کے دیگر قبائل نے قدید کے علاقے میں منات کی عبادت گاہ بنا رکھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں ابوسفیان صخر بن حرب، یا ایک قول کے مطابق علی بن ابی طالب کو بھیج کر اس کو گرا دیا۔ (واقدی کی روایت کے مطابق اس کو سعد بن زید الاشہلی نے گرایا تھا)

قبیلہ دوس، خثعم، بجیلہ اور تبالہ کے علاقے میں دیگر اہل عرب نے ذوالخلصۃ کی عبادت گاہ قائم کر رکھی تھی جس کو وہ کعبہ یمانیہ کے نام سے پکارتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں جریر بن عبداللہ البجلی کو بھیج کر اس کو منہدم کرا دیا۔

سلمیٰ اور آجا کے مابین جبل طے کے قریب قبیلہ طے اور ان کے قریبی قبائل نے فلس کی عبادت گاہ بنا رکھی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی ابن ابی طالب کو بھیج کر اس کو گرا دیا۔

رہاط کے مقام پر قبیلہ ہذیل کی سواع کے نام پر قائم کردہ عبادت گاہ کو حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے منہدم کیا۔ (ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ ۳/۱۱۷۔ تفسیر القرآن العظیم ۴/ ۲۵۳، ۲۵۴)

اس کے ساتھ ساتھ معاہدہ حدیبیہ کے موقع پر قرآن مجید میں سورۃ الفتح نازل ہوئی تو اس میں مشرکین کے خلاف آئندہ جنگ کا ہدف صاف لفظوں میں یہ بیان کیا گیا کہ:

سَتُدْعَوْنَ إِلَى قَوْمٍ أُوْلِي بَأْسٍ شَدِيدٍ تُقَاتِلُونَهُمْ أَوْ يُسْلِمُونَ (الفتح ۱۶)

''جلد ہی تمھیں ایک ایسی قوم کے مقابلے کے لیے بلایا جائے گا جو نہایت جنگجو اور زور آور ہوگی۔ تمھیں ان کے ساتھ لڑنا ہوگا یہاں تک کہ وہ اسلام لے آئیں۔''

اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد سورۂ براءۃ کی وہ ابتدائی آیات نازل کر دی گئیں جن میں بدنیت اور بدعہد مشرک قبائل کے ساتھ کیے جانے والے معاہدوں کو کالعدم قرار دیا گیا اور انھیں چار ماہ کی مہلت دے کر یہ کہا گیا کہ وہ یا تو اسلام قبول کر لیں اور یا اہل ایمان کے ہاتھوں جہنم رسید ہونے کے لیے تیار ہو جائیں:

بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ إِلَى الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ۔ فَسِيحُوا فِي الْأَرْضِ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوا أَنَّكُمْ غَيْرُ

''اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکوں سے براءت کا اعلان ہے جن سے تم نے معاہدے کر رکھے ہیں۔ سو (اے مشرکو) چار ماہ تک زمین میں چل پھر لو اور

مُعْجِزِی اللّٰہِ وَأَنَّ اللّٰہَ مُخْزِی الْکَافِرِیْنَ ..... فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْھُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ وَخُذُوْھُمْ وَاحْصُرُوْھُمْ وَاقْعُدُوْا لَھُمْ کُلَّ مَرْصَدٍ فَإِنْ تَابُوْا وَأَقَامُوا الصَّلَاۃَ وَآتَوُا الزَّکَاۃَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَھُمْ إِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ (توبہ۱-۵)

جان لو کہ اللہ کے آگے تمھارا کوئی زور نہیں چل سکتا اور یہ کہ اللہ کافروں کو رسوا کر کے رہے گا..... پھر جب حرام مہینے گزر جائیں (اور چار ماہ کی مدت پوری ہو جائے) تو مشرکوں کو جہاں پاؤ، قتل کرو اور انھیں پکڑو اور انھیں گھیرو اور ان کے لیے ہر جگہ گھات لگا کر بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی پابندی قبول کر لیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا، مہربان ہے۔‘‘

البتہ اسی سلسلہ بیان میں آیت ۷ میں یہ ہدایت کی گئی کہ حدیبیہ کے مقام پر مشرکین کے ساتھ جو معاہدہ کیا گیا ہے، اس کی پاس داری کی جائے، تا آنکہ مشرکین خود ہی اس کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوں۔

قرآن نے اسی موقع پر یہ حکم بھی دے دیا کہ بیت اللہ کے مسلمانوں کے تصرف میں آنے کے بعد جب حج اکبر کا موقع آئے تو اس موقع پر پورے جزیرۂ عرب کے مشرکین سے بھی براءت کا اعلان کر دیا جائے:

وَأَذَانٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ إِلَی النَّاسِ یَوْمَ الْحَجِّ الْأَکْبَرِ أَنَّ اللّٰہَ بَرِیْءٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ وَرَسُوْلُہٗ فَإِن تُبْتُمْ فَھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَإِن تَوَلَّیْتُمْ فَاعْلَمُوْا أَنَّکُمْ غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰہِ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِعَذَابٍ أَلِیْمٍ۔ (توبہ۳)

’’اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن بھی اعلان کر دیا جائے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بری ہیں۔ پھر (اے مشرکو) اگر تم توبہ کر لو تو یہی تمھارے لیے بہتر ہے اور اگر منہ پھیرو گے تو جان لو کہ تم اللہ کے آگے زور نہیں چلا سکتے اور کافروں کو دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔‘‘

نبی صلی اللہ علیہ سلم نے اسی حکم کی وضاحت میں ارشاد فرمایا کہ:

امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ ویقیموا الصلاۃ ویوتوا الزکاۃ فاذا فعلوا ذلک عصموا منی دماء ھم واموالھم الا

’’مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اس وقت تک لوگوں سے قتال کروں جب تک کہ وہ ’لا الٰہ الا اللہ‘ کا اقرار نہ کر لیں۔ پس جو لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لے گا، اسے میری طرف سے جان اور مال کی امان حاصل ہو جائے گی اور اس کے اعمال کا حساب اللہ کے سپرد ہوگا۔‘‘

بحق الاسلام وحسابھم علی اللہ۔ (بخاری، رقم ۲۴)

مشرکین عرب کے بہت سے گروہوں نے آپ کے اس اعلان ہی کے نتیجے میں دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا جس کے متعدد شواہد حدیث وسیرت کے ذخیرے میں موجود ہیں:

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عجب اللہ من اقوام یجاء بھم فی السلاسل حتی یدخلوا الجنۃ۔ (مسند احمد، رقم ۹۵۰۹)

''اللہ کو ان لوگوں پر تعجب ہے جن کو بیڑیوں میں جکڑ کر لایا جائے تا کہ جنت میں داخل ہو جائیں۔''

بنو بکر بن وائل کے نام خط میں آپ نے انھیں لکھا:

اما بعد فاسلموا تسلموا۔ (الطبقات الکبریٰ ۱/۲۸۱)

''اما بعد! اسلام لے آؤ، بچ جاؤ گے۔''

قبیلہ عبد القیس کا وفد اسلام قبول کرنے کے لیے آیا تو آپ نے ان کے حق میں یوں دعا فرمائی:

اللھم اغفر لعبد القیس اذ اسلموا طائعین غیر کارھین غیر خزایا ولا موتورین اذ بعض قومنا لا یسلمون حتی یخزوا ویوتروا۔ (مسند احمد، رقم ۱۷۱۶۱)

''اے اللہ، قبیلہ عبد القیس کی مغفرت فرما دے کیونکہ یہ کسی زبردستی کے بغیر خود اپنی مرضی سے اسلام لے آئے ہیں۔ یہ نہ رسوا ہوئے ہیں اور نہ ان کو کوئی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ جبکہ ہماری قوم کے کچھ لوگ اس وقت تک ایمان لانے پر آمادہ نہیں ہوتے جب تک کہ انھیں رسوائی اور جانی ومالی نقصان سے سابقہ نہ پیش آ جائے۔''

اس موقع پر آپ نے انصار سے کہا:

یا معشر الانصار اکرموا اخوانکم فانھم اشباھکم فی الاسلام واشبہ شیٔ بکم شعارا وابشارا اسلموا طائعین غیر مکرھین ولا موتورین اذ ابی قوم ان یسلموا حتی قتلوا۔ (مسند احمد، رقم ۱۷۱۶۲)

''اے گروہ انصار، اپنے بھائیوں کا خوب اکرام کرو، کیونکہ یہ (آگے بڑھ کر رضامندی سے) اسلام لانے میں بھی تم سے مشابہ ہیں اور ان کی ظاہری وباطنی حالت بھی تم سے بہت ملتی جلتی ہے۔ انھوں نے جبر واکراہ کے بغیر اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لیا ہے، جبکہ کچھ لوگوں

نے اس سے انکار کیا یہاں تک کہ انھیں قتل کر دیا گیا۔‘‘

بنوخثعم کے نام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خط تحریر فرمایا، ابن سعد نے اس کے الفاظ یہ نقل کیے ہیں:

ومن اسلم منکم طوعا او کرھا فی یدہ حرث ....(الطبقات الکبریٰ ۲۸۶/۱)

’’تم میں سے جنھوں نے اسلام قبول کیا، چاہے طوعاً کیا ہو یا کرہاً، اوران کے پاس کھیتی ہے.....‘‘

۸ ہجری میں بنوتمیم کا وفد بارگاہ نبوی میں حاضر ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر ثابت بن قیس انصاری نے اس موقع پر ان کے سامنے ایک تقریر کی، جس میں انھوں نے کہا:

فنحن انصار اللہ ووزراء رسولہ نقاتل الناس حتی یومنوا باللہ فمن آمن باللہ ورسولہ منع منا مالہ ودمہ ومن کفر جاھدناہ فی اللہ ابدا وکان قتلہ علینا یسیرا ۔(ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۴۷۵/۲)

’’ہم اللہ اور اس کے رسول کے مددگار ہیں۔ ہم اس وقت تک لوگوں سے لڑیں گے جب تک کہ وہ اللہ پر ایمان نہ لے آئیں۔ پس جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آئے گا، اسے ہماری طرف سے جان و مال کی امان حاصل ہوگی۔ اور جو انکار کرے گا، ہم اس کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے اور اس کو قتل کرنے میں ہمیں کوئی تردد نہیں ہوگا۔‘‘

رفاعہ بن زید جذامی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا تو آپ نے انھیں ان کی قوم کے نام حسب ذیل خط دے کر روانہ کیا:

انی بعثتہ الی قومہ عامۃ ومن دخل فیھم، یدعوھم الی اللہ والی رسولہ، فمن اقبل منھم ففی حزب اللہ وحزب رسولہ ومن ادبر فلہ امان شھرین۔ (السیرۃ النبویۃ ۵۰۲/۲)

’’میں نے رفاعہ کو اس کی ساری قوم اور اس میں (باہر سے آ کر) شامل ہونے والوں کی طرف بھیجا ہے تاکہ وہ انھیں اللہ اور اس کے رسول کی طرف دعوت دے۔ تو ان میں سے جو (اس دعوت کو قبول کرنے کے لیے) آگے بڑھیں گے، انھیں اللہ اور اس کے رسول کی جماعت میں شمار کیا جائے گا اور جو لوگ منہ پھیر لیں تو انھیں دو مہینے کی مہلت ہے۔‘‘

رفاعہ یہ خط لے کر اپنی قوم کے پاس گئے تو انھوں نے ان کی دعوت پر اسلام قبول کر لیا۔ صرد بن عبداللہ ازدی نے اپنی قوم بنوازد کے ایک وفد کے ہمراہ بارگاہ رسالت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا تو آپ نے انھیں ان کی قوم کے

مسلمانوں کا امیر مقرر کر کے حکم دیا کہ وہ اپنے علاقے کے مشرکین کے ساتھ جہاد کریں:

فامره رسول الله صلی الله عليه و سلم علی من اسلم من قومه و امره ان يجاهد بمن اسلم من كان يليه من اهل الشرك من قبل اليمن (السیرۃ النبویۃ،۴۹۵/۲)

صرد بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق یمن کے علاقہ جرش میں مشرک قبائل کا محاصرہ کیا اور انھیں اسلام کی دعوت دی۔ پھر ان میں سے جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا، انھیں اپنے ساتھ شامل کر لیا جبکہ انکار کرنے والوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ پھر ایک جنگی تدبیر سے مشرکین کو قلعے سے نکل کر اپنے تعاقب پر آمادہ کیا اور پلٹ کر ان پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں بہت سے مشرک مارے گئے، چنانچہ اہل جرش کا ایک وفد اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر اور اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔ (السیرۃ النبویۃ، ۴۹۵/۲۔ الطبقات الکبریٰ ۵۲۶/۵)

۱۰ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد بن الولید کی قیادت میں چار سو آدمیوں پر مشتمل ایک سریہ نجران کے قبیلہ بنو الحارث بن کعب کی طرف بھیجا اور کہا کہ وہ جا کر ان کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیں اور اگر وہ تین دن تک اس دعوت کو قبول نہ کریں تو ان کے ساتھ قتال کریں۔ خالد نے وہاں پہنچ کر اپنے سواروں کو مختلف اطراف میں بھیجا جنھوں نے اس بات کی منادی کی کہ 'يا بنی الحارث اسلموا تسلموا'۔ (اے بنو الحارث، اسلام لے آؤ، بچ جاؤ گے) اس کے نتیجے میں بنو الحارث نے قتال کی نوبت آنے سے پہلے ہی اسلام قبول کر لیا۔ (طبری، ۱۲۶/۳، ۱۲۷۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۵۰۰/۲)

اس ضمن میں بنو ثقیف کے قبول اسلام کی روداد بھی بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ذخیرۂ سیرت کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۸ ہجری میں طائف کا محاصرہ کرنے کے بعد حالات کی مناسبت سے فی الوقت بنو ثقیف سے جنگ کا فیصلہ موخر کر دیا، تاہم اس محاصرے کے دوران میں بنو ثقیف پر یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ رسول اللہ کی مخالفت مول لے کر جزیرۂ عرب میں پر امن طریقے سے رہنا ان کے لیے ناممکن ہے، چنانچہ اشاعت اسلام سے خوف زدہ ہو کر اور اپنے معاشی مفادات کے تحفظ کے لیے انھوں نے طوعاً و کرہاً اسلام قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابن ہشام نے ثقیف کے سردار عمرو بن عبد یا لیل کی گفتگو یوں نقل کی ہے:

انه قد نزل بنا امر ليست معه هجرة انه — ”ہمیں ایک ایسی صورت حال میں گرفتار ہو گئے ہیں

قد كان من امر هذا الرجل ما قد رايت، قد اسلمت العرب كلها وليس لكم بحربهم طاقة فانظروا فی امركم ۔(السيرة النبويہ۴۵۶/۲)

جس سے کوئی مفر نہیں۔ اس شخص (محمد) کا معاملہ تم دیکھ رہے ہو کہ سارا عرب اسلام قبول کر چکا ہے اور اور تمھارے پاس ان سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں ہے، اس لیے اپنے معاملے میں غور کرو۔''

انا نخاف هذا الرجل قد اوطا الارض غلبة ونحن فی حصن فی ناحية من الارض والاسلام حولنا فاش والله لو قام علی حصننا شهرا لمتنا جوعا وما اری الا الاسلام وانا اخاف يوما مثل يوم مكة۔ (الواقدی،۹۶۷/۳)

''ہم اس شخص سے خوف زدہ ہیں۔ اس نے پوری سرزمین عرب کو روند کر مغلوب کر لیا ہے۔ ہم اس سرزمین کے ایک کونے میں ایک قلعے میں بند ہیں اور ہمارے اردگرد اسلام پھیل چکا ہے۔ بخدا، اگر وہ ایک مہینے تک ہمارے قلعے کا محاصرہ جاری رکھتے تو ہم بھوکوں مر جاتے۔ مجھے اسلام قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ ورنہ مجھے خدشہ ہے کہ ہمارا حال بھی ایک دن وہی ہوگا جو مکے والوں کا ہوا۔''

چنانچہ اہل طائف کا ایک وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔ اس موقع پر انھوں نے اپنے بتوں کی حفاظت اور شراب، زنا اور سود کے کاروبار کو جاری رکھنے کے حوالے سے بعض شرطیں منوانا چاہیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یکسر مسترد کر دیا۔ یہ وفد واپس طائف پہنچا تو اس کے تاثرات یہ تھے:

فقالوا جئناكم من عند رجل فظ غليظ ياخذ من امره ما شاء قد ظهر بالسيف واداخ العرب ودان له الناس ورعبت منه بنو الاصفر فی حصونهم والناس فيه اما راغب فی دينه واما خائف من السيف۔ (الواقدی،۹۶۹/۳)

''انھوں نے کہا: ہم ایک نہایت درشت اور تندخو آدمی کے پاس سے آ رہے ہیں جو صرف اپنی من مانی کرتا ہے۔ وہ تلوار لے کر اٹھا ہے اور پورے عرب کو اس نے زیر کر لیا ہے۔ لوگ بھی اس کے مطیع بن چکے ہیں اور رومیوں پر اپنے قلعوں میں اس کا رعب طاری ہے۔ اب دو ہی طرح کے لوگ رہ گئے ہیں: کچھ تو اپنی مرضی سے اس کے دین کی طرف راغب ہیں اور کچھ محض تلوار کے ڈر سے اطاعت قبول کر رہے ہیں۔''

فتح مکہ کے بعد اس عمومی تاثر کا اظہار ارباب سیرت نے جگہ جگہ کیا ہے۔ واقدی لکھتے ہیں:

والاسلام یومئذ لم یعم العرب قد بقیت بقایا من العرب وھم یخافون السیف لما فعل رسول الله صلی الله علیه وسلم بمکة وحنین۔ (الواقدی، ۳/ ۹۷۴)

''اسلام ابھی سارے اہل عرب میں نہیں پھیلا تھا بلکہ کچھ لوگ ابھی باقی تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ اور حنین میں مشرکین کے ساتھ جو کیا، اس کے پیش نظر وہ بھی اسلام کی تلوار سے خوف زدہ تھے۔''

مشرکین کے بارے میں آپ کی یہ پالیسی اس قدر واضح تھی کہ جزیرۂ عرب کے مختلف اطراف میں آباد بہت سے لوگوں نے اسلام قبول کرنے کے بعد آپ کی طرف سے کسی خصوصی حکم کے بغیر ازخود مشرکین کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ مثلاً تبوک سے واپسی پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حمیر کے سرداروں حارث بن عبد کلال، نعیم بن عبد کلال اور نعمان کا خط ملا جس میں انھوں نے آپ کو اپنے اسلام قبول کرنے اور اپنے علاقے میں موجود مشرکوں کو قتل کرنے کی خبر دی۔ آپ نے جواب میں انھیں لکھا:

قد وقع بنا رسولکم ..... وانبانا باسلامکم وقتلکم المشرکین وان الله قد ھداکم بھداہ۔ (السیرۃ النبویۃ، ۲/ ۴۹۷)

''تمھارا قاصد ہمارے پاس پہنچا ہے اور اس نے ہمیں تمھارے اسلام قبول کرنے اور مشرکین کو قتل کرنے کی خبر دی ہے اور یہ کہ اللہ نے تمھیں اپنی ہدایت سے نوازا ہے۔''

البتہ آپ نے اس خط میں انھیں تاکید کی کہ کسی یہودی یا نصرانی کو اس کے دین سے نہ ہٹایا جائے، بلکہ اس پر جزیہ عائد کر دیا جائے۔ اسی طرح آپ نے حمیر ہی کے ایک سردار زرعہ ذی یزن کے نام خط میں لکھا:

ان مالك بن مرۃ الرھاوی قد حدثنی انك اسلمت من اول حمیر وقتلت المشرکین فابشر بخیر۔ (السیرۃ النبویۃ ۲/ ۴۹۸)

''مالک بن مرہ رہاوی نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے حمیر میں سب سے پہلے اسلام قبول کر لیا ہے اور مشرکین کو قتل کیا ہے، سو بھلائی کی خوش خبری قبول کرو۔''

اسی تناظر میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے بادشاہ منذر بن ساویٰ کو خط لکھ کر ہدایت کی کہ مجوس میں سے جو اپنے دین پر قائم رہنا چاہے، اس سے جزیہ وصول کیا جائے تو منافقین نے اس بات کو پراپیگنڈا کا موضوع بنا لیا اور کہا کہ:

زعم محمد انه انما بعث لقتال الناس کافة حتی یسلموا ولا یقبل الجزیة الا من اهل الکتاب ولا نراه الا قد قبل من مشرکی اهل هجر ما رد علی مشرکی العرب (المدونۃ الکبریٰ ۳/۴۷)

''محمد نے اعلان کیا تھا کہ وہ اس لیے بھیجا گیا ہے کہ وہ سب لوگوں کے ساتھ لڑیں یہاں تک کہ وہ اسلام لے آئیں اور یہ کہ وہ اہل کتاب کے علاوہ کسی سے جزیہ قبول نہیں کریں گے، لیکن اب ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے عرب کے مشرکوں سے جو بات (یعنی جزیہ دے کر اپنے مذہب پر قائم رہنا) قبول نہیں کی، اہل ہجر کے مشرکوں سے وہی بات قبول کر لی ہے۔''

مزید برآں اہل عرب کے جبراً اسلام قبول کرنے کی ایک بڑی واضح دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوتے ہی عرب کے بیشتر قبائل مرتد ہو گئے اور صحابہ کو دوبارہ جہاد بالسیف کر کے انھیں مطیع بنانا پڑا۔ یہ صورت حال صرف دور دراز کے علاقوں تک محدود نہیں تھی، بلکہ خود مرکز اسلام یعنی مکہ مکرمہ میں بھی بڑے پیمانے پر لوگ ارتداد پر آمادہ ہو چکے تھے۔ (ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۲/ ۵۵۸) عبد اللہ بن عمر نے ایک موقع پر اس صورت حال کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

لما مات النبی صلی الله علیه وسلم تشایع الناس وتحزبوا فقامت تلك الناصیة فقاتلوا الناس حتی ردوا الناس الی کلمة الاسلام وحتی قالوا لا اله الا الله وان نبیکم حق (مسند الشامیین، رقم ۱۶۶۱)

''جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو لوگ (اسلام کو چھوڑ کر) مختلف گروہوں اور دھڑوں میں بٹ گئے، چنانچہ آپ کے ساتھیوں کا گروہ اٹھا اور اس نے لوگوں کے ساتھ قتال کیا یہاں تک کہ انھیں کلمہ اسلام کی طرف واپس لوٹا دیا اور منکرین کو یہ اقرار کرنا پڑا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ تمھارا نبی برحق ہے۔''

اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ تمام قبائل اپنی رضامندی اور اختیار سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے تھے تو اتنے وسیع پیمانے پر ان کے دین سے مرتد ہو جانے یا مرکز اسلام کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کا رویہ کسی طرح بھی قابل فہم نہیں رہتا۔

صحابہ کرام نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جنگی اقدامات کی تعبیر اسی پہلو سے کی ہے۔

حسان بن ثابت نے اپنے بعض اشعار میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے:

اما قریش فانی لن اسالمهم
حتی ینیبوا من الغیات للرشد
ویترکوا اللات والعزی بمعزلة
ویسجدوا کلهم للواحد الصمد
ویشهدوا ان ما قال الرسول لهم
حق ویوفوا بعهد الله والوکد

’’میں قریش کے ساتھ ہرگز صلح نہیں کروں گا، یہاں تک کہ وہ گمراہی چھوڑ کر سیدھی راہ پر آ جائیں، لات وعزیٰ کی عبادت سے کنارہ کش ہوکر سب کے سب ایک خدا کے سامنے سجدہ کرنے لگیں، اس بات کا اقرار کرلیں کہ رسول نے ان سے جو کہا ہے، وہ حق ہے اور اللہ کے مضبوط عہد کی پاس داری کریں۔‘‘

(ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۲/ ۲۶۰، ۲۶۱)

عباس بن مرداس السلمی نے اپنے قصیدے میں کہا ہے:

فان یهدوا الی الاسلام یلفوا
وان لم یسلموا فهم اذان
انوف الناس ما سمر السمیر
بحرب الله لیس لهم نصیر

’’اگر وہ اسلام قبول کرلیں گے تو رہتی دنیا تک لوگوں کے مابین سربلند رہیں گے، لیکن اگر اسلام نہیں لائیں گے تو اللہ کی طرف سے ان کے ساتھ اعلان جنگ ہے جس میں ان کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔‘‘

(ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۲/ ۳۸۳)

کعب بن مالک نے بنوثقیف کو مخاطب کرکے کہا:

فان تلقوا الینا السلم نقبل — ونجعلکم لنا عضدا وریفا
وان تابوا نجاهدکم ونصبر — ولا یك امرنا رعشا ضعیفا
نجاهد ما بقینا او تنیبوا — الی الاسلام اذعانا مضیفا

....

بکل مهند لین صقیل — یسوقهم بها سوقا عنیفا
لامر الله والاسلام حتی — یقوم الدین معتدلا حنیفا
وتنسی اللات والعزی وود — ونسلبها القلائد والشنوفا

(السیرۃ النبویۃ ۲/ ۴۰۷، ۴۰۸)

’’اگر تم ہمیں صلح کا پیغام دو گے تو ہم قبول کرلیں گے اور تمھیں اپنا معاون بنا کر تمھارے سرسبز وشاداب علاقے

سے لطف اندوز ہوں گے، لیکن اگر انکار کرو گے تو ہم پوری ثابت قدمی سے جہاد کریں گے اور ہماری استقامت میں کوئی اضطراب یا کمزوری نہیں ہوگی۔ جب تک ہم زندہ رہیں گے، برسر جنگ رہیں گے تا آنکہ تم اسلام کی طرف رجوع کرلو اور پوری طرح اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دو۔.... ہماری تیز دھار، پتلی اور صیقل شدہ تلواریں لوگوں کو پوری قوت سے اللہ کے دین، اسلام کی طرف دھکیلتی رہیں گی یہاں تک کہ یہ دین توحید مضبوط اور مستحکم ہو جائے اور لات وعزیٰ اور ود کا نام ونشان مٹ جائے اور ہم ان (بتوں کو چڑھائے جانے والے) ہار اور کانٹے ان سے چھین لیں۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سقیفہ بن ساعدہ میں انصار کے اجتماع میں سعد بن عبادہ نے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

رزقکم الله الایمان به و برسوله والمنع له و لاصحابه والاعزاز له ولدینه والجهاد لاعدائه فکنتم اشد الناس علی عدوه منکم واثقله علی عدوه من غیرکم حتی استقامت العرب لامر الله طوعا و کرها واعطی البعید المقادة صاغرا داخرا حتی اثخن الله عز و جل لرسوله بکم الارض ودانت باسیافکم له العرب۔ (طبری ۳/۲۱۸)

''اللہ نے تمھیں یہ توفیق دی کہ تم اس پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور تمھیں ان کی اور ان کے ساتھیوں کی حفاظت، پیغمبر کے لائے ہوئے دین کو غالب اور اس کے دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ چنانچہ رسول اللہ کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کے خلاف سب سے زیادہ مضبوطی اور صلابت تم نے ہی دکھائی، یہاں تک کہ اہل عرب طوعاً وکرہاً اللہ کے دین کے تابع ہو گئے اور دور دراز کے قبائل نے بھی ذلت اور پستی کے ساتھ اطاعت قبول کر لی۔ اس طرح اللہ نے تمھارے ذریعے سے اس سرزمین کو پیغمبر کے لیے مغلوب کر دیا اور تمہاری تلواروں کی مدد سے اہل عرب پیغمبر کے مطیع ہو گئے۔''

سیدنا ابوبکر نے ایک موقع پر فرمایا:

ان الله بعث محمدا صلی الله علیه و سلم بهذا الدین فجاهد علیه حتی دخل الناس فیه طوعا و کرها۔

''اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دین دے کر بھیجا، چنانچہ آپ نے اس کے لیے جہاد کیا یہاں تک کہ لوگ خواہی نخواہی اس میں داخل ہو گئے۔''

(ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ ۲/۵۲۶)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد مرتد ہونے والے قبائل کے اپنے خط میں انھوں نے فرمایا:

ان الله تعالی ارسل محمدا بالحق من عنده الی خلقه بشیرا ونذیرا وداعیا الی الله باذنه وسراجا منیرا لینذر من کان حیا ویحق القول علی الکافرین فهدی الله بالحق من اجاب الیه وضرب رسول الله صلی الله علیه وسلم باذنه من ادبر عنه حتی صار الی الاسلام طوعا وکرها۔ (طبری، ۳/۲۵۰)

''اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے پاس سے دین حق دے کر اپنی مخلوق کی طرف بھیجا تاکہ وہ انھیں خوش خبری سنائیں، انذار کریں، اللہ کے حکم سے اس کی طرف بلائیں، اور ایک روشن چراغ بن کر لوگوں کو حق کی راہ دکھائیں۔ اللہ کا مقصد یہ تھا کہ یہ رسول ان لوگوں کو انذار کرے جن کے دل زندہ ہیں اور انکار کرنے والوں پر اللہ کے عذاب کا فیصلہ نافذ ہو جائے۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس دین کی طرف رغبت ظاہر کی، اللہ نے انھیں ہدایت عطا کی اور جنھوں نے اس سے اعراض کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے ان کے خلاف لڑائی کی یہاں تک کہ وہ خواہی نخواہی اسلام لانے پر آمادہ ہو گئے۔''

نعمان بن مقرن نے یزدگرد کے دربار میں یہی بات کہی:

ان الله رحمنا فارسل الینا رسولا یدلنا علی الخیر ویامرنا به ویعرفنا الشر وینهانا عنه ووعدنا علی اجابته خیر الدنیا والآخرة فلم یدع الی ذلك قبیلة الا صاروا فرقتین فرقة تقاربه وفرقة تباعده ولا یدخل معه فی دینه الا الخواص فمکث کذلك ما شاء الله ان یمکث ثم امر ان ینهد الی من خالفه من العرب ویبدا بهم ففعل فدخلوا معه جمیعا علی وجهین مکروه علیه فاغتبط وطائع

''اللہ تعالیٰ نے ہم پر رحمت فرمائی اور ہمارے پاس ایک رسول بھیجا جس نے ہمیں خیر کی باتیں بتا کر ان پر عمل کرنے کا اور شر کی باتیں بتا کر ان سے باز رہنے کا حکم دیا اور اس دعوت کو قبول کرنے پر ہم سے دنیا وآخرت کی بھلائی کا وعدہ کیا۔ چنانچہ اس نے جس قبیلے کے سامنے بھی یہ دعوت پیش کی، وہ دو گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک گروہ اس کے قریب ہو گیا جبکہ دوسرے نے اس سے دوری اختیار کر لی۔ (ابتدا میں تو) اس رسول کے دین میں کچھ خاص گروہ ہی شامل ہوئے اور جب

اياه فازداد۔ (ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، ۷/۴۱)

تک اللہ نے چاہا، یہی صورت حال رہی۔ پھر اسے حکم ملا کہ وہ اٹھے اور اس دین کی مخالفت کرنے والے اہل عرب کے ساتھ برسرپیکار ہو جائے۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا جس کے نتیجے میں اہل عرب سب کے سب اس دین میں داخل ہو گئے۔ ان میں سے جن سے جبراً یہ دین منوایا گیا تھا، وہ اچھے حال میں رہے اور جو اپنی رضامندی سے داخل ہوئے تھے، ان کی بھلائی میں اور اضافہ ہو گیا۔''

رومی فوج کے سالار جرجہ سے گفتگو کرتے ہوئے خالد بن ولید نے کہا:

انا قبلنا هذا الامر عنوة ۔ (البدایہ والنہایہ ۷/۱۳)

''ہم نے اس دین کو اپنی مرضی کے برعکس قبول کیا تھا۔''

سیدنا ابوہریرہ 'کنتم خير امة اخرجت للناس' کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

خير الناس للناس تاتون بهم في السلاسل في اعناقهم حتى يدخلوا في الاسلام ۔ (بخاری، رقم ۴۱۹۱)

''تم لوگوں کے لیے اس لحاظ سے ایک بہترین قوم ہو کہ ان کی گردنوں میں طوق ڈال کر انھیں لاتے ہو یہاں تک کہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔''

اکابر تابعین نے بھی مشرکین عرب کے معاملے میں اسی قانون کی تصریح کی ہے۔ حسن بصری کا ارشاد ہے:

قاتل رسول الله صلى الله عليه وسلم اهل هذه الجزيرة من العرب على الاسلام لم يقبل منهم غيره۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۱۲۶۷۹)

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرۂ عرب کے مشرکین کے ساتھ اس بات پر قتال کیا کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ آپ نے اسلام کے علاوہ ان سے کوئی بات قبول نہیں کی''۔

ابن شہاب زہری فرماتے ہیں:

انزلت في كفار قريش والعرب وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون

''کفار قریش اور عرب کے بارے میں تو یہ آیت اتری: 'وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون

الـديـن لـلـه وانزلت فى اهل كتاب قاتلوا الذين لا يومنون بالله ولا باليوم الآخر ولا يـحرمون ما حرم الله ورسوله ولا يدينون دين الحق الى قوله صاغرون۔ (بلاذری،فتوح البلدان،۷۵)

الدین لله' جبکہ اہل کتاب کے بارے میں یہ حکم نازل ہوا'قـاتـلوا الذين لا يومنون بالله ولا باليوم الآخـر ولا يـحـرمـون ما حرم الله ورسوله ولا يـديـنـون ديـن الـحق الـى قـولـه صاغرون'۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام پر ایمان نہ لانے والا دوسرا بڑا گروہ اہل کتاب کا تھا۔ آپ اگرچہ اصلاً عرب کے امیوں میں اٹھائے گئے تھے اور آپ کی بعثت خاصہ کا ہدف یہ تھا کہ انھیں کفر وشرک سے پاک کر کے دوبارہ دین ابراہیمی کا پیروکار بنا دیں اور دنیا کے سامنے اس دین کی گواہی دینے کی ذمہ داری انھیں تفویض کر دیں، تاہم قرآن نے یہ اعلان کیا کہ آپ کو پوری دنیاے انسانیت کی طرف بھی نبی بنا کر بھیجا گیا ہے اور دنیا کے تمام گروہ آپ کی دعوت کے مخاطب اور آپ پر ایمان لانے کے مکلّف ہیں۔ چنانچہ قرآن نے غیرمبہم لفظوں میں واضح کیا ہے کہ اللہ کے ہاں جو دین قبول کیا جائے گا، وہ اسلام ہی ہے جس کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا گیا ہے اور اس کی پیروی اختیار کرنا عرب کے امیوں اور اہل کتاب دونوں کے لیے لازم ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

إِنَّ الـدِّيْـنَ عِـندَ اللّهِ الإِسْلاَمُ .... وَقُل لِّلَّذِيْنَ أُوْتُواْ الْكِتَابَ وَالأُمِّيِّيْنَ أَأَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُواْ فَقَدِ اهْتَدَواْ وَّإِن تَوَلَّوْاْ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلاَغُ وَاللّهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ۔ (آل عمران ۱۹، ۲۰)

''اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔۔۔ اور تم اہل کتاب اور ان امیوں سے کہہ دو کہ کیا تم اسلام لاتے ہو؟ پھر اگر وہ اسلام لے آئیں تو ہدایت پا لیں گے اور اگر منہ موڑیں تو تمھارے ذمے صرف بات کو پہنچا دینا ہے اور اللہ اپنے بندوں کو خوب دیکھ رہا ہے۔''

سورۂ اعراف میں ارشاد ہوا ہے:

قُـلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعاً الَّذِيْ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالأَرْضِ لا إِلَـــهَ إِلاَّ هُوَ يُحْيِـيْ وَيُمِيْتُ فَآمِنُواْ بِاللّهِ وَرَسُوْلِـهِ الـنَّبِـيِّ الأُمِّـيِّ الَّـذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۔ (الاعراف ۱۵۷، ۱۵۸)

''کہہ دو کہ اے لوگو، میں تم سب کی طرف اللہ کا پیغمبر ہوں، وہ کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ زندگی اور موت دیتا ہے۔ اس لیے اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ، یعنی یہ نبی امی جو اللہ اور اس کے کلمات پر ایمان رکھتا ہے، اور اس کی پیروی کرو تا کہ تم ہدایت پا جاؤ۔''

قرآن نے اہل کتاب کو مخاطب کر کے صریح لفظوں میں کہا ہے کہ اگر وہ آپ پر ایمان نہیں لائیں گے تو خدا کے عذاب کے مستحق ٹھیریں گے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ أُوتُواْ الْكِتَابَ آمِنُواْ بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقاً لِّمَا مَعَكُم مِّن قَبْلِ أَن نَّطْمِسَ وُجُوهاً فَنَرُدَّهَا عَلَى أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ وَكَانَ أَمْرُ اللّهِ مَفْعُولاً ۔ (نساء ۴۷)

''اے وہ لوگو جنھیں کتاب دی گئی، اس (قرآن) پر ایمان لے آؤ جو ہم نے اس چیز کی تصدیق کے طور پر نازل کیا ہے جو تمھارے پاس موجود ہے، اس سے پہلے کہ ہم چہروں کو مسخ کر دیں اور ان کا رخ ان کی پیٹھ کی طرف پھیر دیں یا ان پر اسی طرح لعنت کریں جیسے ہم نے ہفتے کے دن (خدا کی حدود پامال کرنے) والوں پر لعنت کی۔ اور اللہ کا فیصلہ نافذ ہو کر رہتا ہے۔''

تاہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہود نے نہ صرف آپ پر ایمان لانا گوارا نہیں کیا، بلکہ آپ کی پھیلتی ہوئی دعوت کے مستقبل کو بھانپتے ہوئے اس کی مخالفت کے لیے پر تولنا شروع کر دیے اور جزیرۂ عرب پر دین اسلام کی بالادستی کو روکنے کے لیے لوگوں کو اس سے روکنے اور اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ساز باز سمیت ہر حربہ اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ابتداءً تو اہل ایمان کو ان سے صرف نظر کرنے کی ہدایت فرمائی، (بقرہ ۱۰۹) تاہم اس کے ساتھ ساتھ قرآن نے یہ بھی واضح کیا کہ اسلام اور اہل اسلام کو زک پہنچانے کے لیے یہود کی تمام سازشیں اور کوششیں بے کار رہیں گے اور وہ مسلمانوں کے مقابلے میں بھی ذلت و مسکنت کے اسی عذاب سے دوچار ہوں گے جو انبیا کی تکذیب کی پاداش میں ان پر قیامت تک کے لیے لازم کر دیا گیا ہے۔ (آل عمران ۱۱۱، ۱۱۲) پھر ایک خاص حد تک عفو و درگزر سے کام لینے کے بعد سورۂ مائدہ کی آیت ۳۳ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قتال اور محاربہ کی راہ اختیار کرنے والے تمام گروہوں، بالخصوص یہود کی سرکوبی کے لیے نہایت واضح اور متعین ہدایات دے دی گئیں۔ ارشاد ہوا ہے:

إِنَّمَا جَزَاء الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الأَرْضِ فَسَاداً أَن يُقَتَّلُواْ أَوْ يُصَلَّبُواْ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلافٍ أَوْ يُنفَوْاْ مِنَ الأَرْضِ ذَلِكَ لَهُمْ خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا وَلَهُمْ فِي الآخِرَةِ عَذَاب

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے خلاف برسر جنگ ہو جائیں اور زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کریں، ان کی سزا بس یہی ہے کہ ان کو عبرت ناک طریقے سے قتل کر دیا جائے یا سولی چڑھا دیا جائے یا ان کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹ دیے جائیں یا اس سرزمین سے

عَظِیۡمٌ (المائدہ: ۳۳)

انھیں جلاوطن کر دیا جائے۔ یہ رسوائی تو ان کے لیے دنیا میں مقدر کی گئی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حکم کے تحت بنو قریظہ کے بالغ مردوں کو قتل کی جبکہ بنو قینقاع، بنو نضیر، اہل خیبر، اہل فدک اور اہل نجران کو مختلف اوقات میں جلاوطنی کی سزا دی گئی۔ یہود کے یہی قبائل تھے جو عملاً مسلمانوں کے خلاف محاربہ اور فساد کا رویہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ ۷ ہجری میں خیبر کے فتح ہو جانے کے بعد بحیثیت ایک قوم کے ان کی قوت ٹوٹ گئی اور وہ فتنہ وفساد کی صلاحیت سے بڑی حد تک محروم ہو گئے، چنانچہ عہد رسالت میں غزوۂ خیبر کے بعد مذکورہ گروہوں میں سے کسی کے خلاف عملی اقدام کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ البتہ سورۂ توبہ میں جب مشرکین سے اعلان براءت کے بعد ان کے قتل عام کا حکم دیا گیا تو اہل کتاب کے بارے میں بھی یہ ہدایت کی گئی کہ چونکہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دعواے نبوت کی حقانیت واضح ہونے کے باوجود آپ پر ایمان نہیں لائے، اس لیے ان کے خلاف قتال کر کے انھیں محکوم بنا لیا جائے اور ذلت ورسوائی کی ایک علامت کے طور پر ان پر 'جزیہ' عائد کر دیا جائے۔ قرآن نے واضح کیا ہے کہ اس مقصد کے تحت اہل کتاب کے خلاف قتال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصد بعثت یعنی 'اظہار دین' ہی کا ایک لازمی حصہ ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

قَاتِلُوا الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَلَا بِالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوۡنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوۡلُہٗ وَلَا یَدِیۡنُوۡنَ دِیۡنَ الۡحَقِّ مِنَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ حَتّٰی یُعۡطُوا الۡجِزۡیَۃَ عَنۡ یَّدٍ وَّہُمۡ صٰغِرُوۡنَ .... یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّطۡفِـُٔوۡا نُوۡرَ اللّٰہِ بِاَفۡوَاہِہِمۡ وَیَاۡبَی اللّٰہُ اِلَّاۤ اَنۡ یُّتِمَّ نُوۡرَہٗ وَلَوۡ کَرِہَ الۡکٰفِرُوۡنَ ۔ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَہٗ بِالۡہُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡہِرَہٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّہٖ وَلَوۡ کَرِہَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ۔ (التوبہ ۲۹-۳۳)

''ان اہل کتاب کے ساتھ جنگ کرو جو نہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہ اللہ اور اس کے رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں اور نہ دین حق کی پیروی قبول کرتے ہیں۔ (ان کے ساتھ جنگ کرو) یہاں تک کہ یہ تمھارے مطیع بن کر ذلت اور پستی کی حالت میں جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائیں۔... یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کا نور اپنے مونہوں سے بجھا دیں، لیکن اللہ کا فیصلہ ہے کہ وہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا، چاہے کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے تاکہ اسے سارے دینوں پر غالب کر دے، چاہے مشرکوں کو یہ

بات کتنی ہی ناپسند ہو۔‘‘

یہ قرآن مجید میں جہاد وقتال کے احکام کا اصل تناظر ہے اور اس سے واضح ہے کہ مشرکین اور اہل کتاب کے خلاف قتال کے یہ احکام محض مسلمانوں کے دفاع اور اہل کفر کے فتنہ وفساد کو دفع کرنے کے لیے نہیں، بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی اور شرک کا خاتمہ کرنے کے لیے دیے گئے تھے۔ یہ ایک ’مقدس جنگ‘ (Holy war) تھی جس کا محرک مال ومنال اور سطوت وشوکت کا حصول نہیں، بلکہ خدا کے حکم پر اسی کے ایک مقصد کو پورا کرنا تھا۔ یہی وہ پہلو ہے جس کی بنیاد پر قرآن نے اس قتال کو ’جہاد فی سبیل اللہ‘ کا عنوان دیا، اس میں حصہ لینے کو اللہ کے ساتھ ایک سودا قرار دیا، اس میں جان ومال قربان کرنے والوں کو ’انصار اللہ‘ کا لقب دیا اور اس سے گریز کرنے والے اہل ایمان کو جا بجا وعیدیں سنائی ہیں۔ ارشاد ہوا ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَن تَكْرَهُواْ شَيْئاً وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَن تُحِبُّواْ شَيْئاً وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لاَ تَعْلَمُونَ (البقرہ ۲:۲۱۶)

’’تم پر لڑنا فرض کر دیا گیا ہے، حالانکہ وہ تمھیں ناپسند ہے۔ توقع ہے کہ ایک چیز کو تم ناپسند کرو جبکہ وہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اور توقع ہے کہ ایک چیز کو تم پسند کرو جبکہ وہ تمہارے لیے بری ہے۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔‘‘

سورہ نساء میں فرمایا:

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلاَةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلا أَخَّرْتَنَا إِلَى أَجَلٍ قَرِيبٍ قُلْ مَتَاعُ الدَّنْيَا قَلِيلٌ وَالآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَى وَلاَ تُظْلَمُونَ فَتِيلاً۔ (النساء ۴:۷۷)

’’کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ پھر جب ان پر قتال فرض کر دیا گیا تو اب ان میں سے ایک گروہ اس طرح دشمن سے ڈرنے لگا جیسے اللہ سے ڈرنا چاہیے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اور انھوں نے کہا کہ یا اللہ، تو نے کیوں ہم پر لڑنا فرض کر دیا؟ کیوں نہ تو نے کچھ مدت کے لیے ہمیں مزید مہلت دے دی؟ تم کہہ دو کہ دنیا کا سامان تو بہت تھوڑا ہے جبکہ جو لوگ اللہ سے ڈریں، ان کے لیے آخرت بہت بہتر ہے اور (تمہارے اعمال کے معاملے میں) تمہاری ذرہ برابر

بھی حق تلفی نہیں ہوگی۔''

سورۂ توبہ میں ارشاد ہوا ہے:

إِنَّ اللّٰـهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰـهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْداً عَلَيْهِ حَقّاً فِيْ التَّوْرَاةِ وَالإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُواْ بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُم بِهِ وَذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (التوبہ۔۱۱۱)

''اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس وعدے پر خرید لیے ہیں کہ انھیں بدلے میں جنت ملے گی۔ وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں تو وہ قتل کرتے بھی ہیں اور انھیں قتل کیا بھی جاتا ہے۔ اللہ نے تورات اور انجیل اور قرآن میں اس وعدے کو پورا کرنا اپنے ذمے ٹھہرایا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنے عہد کو پورا کرنے والا ہوسکتا ہے؟ اس لیے (اے ایمان والو) تم نے جو سودا کیا ہے، اس پر خوش ہو جاؤ اور یہی عظیم کامیابی ہے۔''

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيْلَ لَكُمُ انفِرُوا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الأَرْضِ أَرَضِيْتُم بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الآخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِيْ الآخِرَةِ إِلَّا قَلِيْلٌ ۔ إِلَّا تَنفِرُواْ يُعَذِّبْكُمْ عَذَاباً أَلِيْماً وَيَسْتَبْدِلْ قَوْماً غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْئاً وَاللّٰهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (التوبہ۳۸،۳۹)

''اے ایمان والو، تمھیں کیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے راستے میں نکلو تو تم بوجھل ہو کر زمین کے ساتھ چپک رہتے ہو! کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر راضی ہوگئے ہو؟ تو پھر آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی تو نہایت ہی حقیر ہے اگر تم نہ اٹھو گے تو خدا تمھیں دردناک عذاب دے گا اور تمھاری جگہ دوسری قوم لائے گا اور تم اس کو کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکو گے اور اللہ ہر بات پر قادر ہے۔''

(باقی)

محمد رفیع مفتی

متفرق سوالات

[المورد میں خطوط اور ای میل کے ذریعے سے دینی موضوعات پر سوالات موصول ہوتے ہیں۔ المورد کے شعبۂ علم و تحقیق اور شعبۂ تعلیم و تربیت کے رفقا ان سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ ان میں سے منتخب سوال و جواب کو افادۂ عام کے لیے یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔]

جائداد پر زکوٰۃ

سوال: میں اپنی جائداد پر واجب زکوٰۃ کیسے طے کروں۔ مزید براں کیا مجھے اپنے مکانوں پر زکوٰۃ دینا ہوگی اور میری بیوی کو اپنے مکان اور اپنے زیورات پر بھی زکوٰۃ دینا ہوگی؟ (افتخار صدیقی)

جواب: اگر میاں کی جائداد بھی ہے اور بیوی کی بھی تو دونوں کو اپنی اپنی جائداد پر زکوٰۃ دینا ہوگی۔

غامدی صاحب کے نقطۂ نظر کے مطابق اسلام نے ہم پر درج ذیل شرح سے زکوٰۃ عائد کی ہے:

''پیداوار، تجارت اور کاروبار کے ذرائع، ذاتی استعمال کی چیزوں اور حد نصاب سے کم سرمایے کے سوا کوئی چیز بھی زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ یہ ہر مال، ہر قسم کے مواشی اور ہر نوعیت کی پیداوار پر عائد ہوگی اور ہر سال ریاست کے ہر مسلمان شہری سے لازماً وصول کی جائے گی۔

اس کی شرح یہ ہے:

مال میں ۲ ۱/۲ فی صدی سالانہ (اگر وہ مال ۶۴۲ گرام چاندی کی مالیت سے زیادہ ہے)۔

پیداوار میں اگر وہ اصلاً محنت یا اصلاً سرمایے سے وجود میں آئے تو ہر پیداوار کے موقع پر اُس کا ۱۰ فی صدی، اور اگر محنت اور سرمایہ، دونوں کے تعامل سے وجود میں آئے تو ۵ فی صدی، اور دونوں کے بغیر محض عطیۂ خداوندی کے طور پر حاصل ہو جائے تو ۲۰ فی صدی۔‘‘ (میزان ۳۵۰)

اس اصول کے مطابق آپ کو ان مکانوں پر کوئی زکوٰۃ نہیں دینا جن میں آپ رہ رہے ہیں یا وہ آپ کے زیر استعمال ہیں۔ جو مکان کرایے پر اٹھے ہیں تو ان کے کرایے کا دس فی صد دینا ہو گا اور اگر وہ محض جائداد کی صورت میں قیمت بڑھنے پر بیچنے کے لیے روکے ہوئے ہیں تو پھر ہر سال ان کی حاضر مالیت کا ڈھائی فی صد دینا ہو گا۔

زیورات پر مال کی زکوٰۃ (حاضر مالیت کا ڈھائی فی صد) لگے گی۔ اپنے کاروبار سے (جس میں آپ کا سرمایہ اور آپ کی محنت، دونوں صرف ہوتے ہیں اس سے) ہونے والی آمدنی اگر آپ کی حقیقی ضروریات کے بقدر رقم سے زیادہ ہے تو پھر کل آمدنی کا پانچ فی صد آپ کو دینا ہو گا۔

یوسف علیہ السلام اور حکومت مصر

سوال: یوسف علیہ السلام اپنے زمانۂ حکومت میں کیا حکومت مصر کے ملازم تھے یا وہ ملک چلانے کے لیے پورے اختیارات رکھتے تھے؟ (عبدالحمید)

جواب: یوسف علیہ السلام کو مصر میں ملک چلانے کے پورے اختیارات حاصل تھے۔ اس کی دلیل درج ذیل آیات ہیں:

’’اور بادشاہ نے کہا، اُس کو میرے پاس لاؤ، میں اُس کو اپنا معتمد خاص بناؤں گا۔ پھر جب اُس سے بات چیت کی تو کہا: اب تم ہمارے ہاں با اقتدار اور معتمد ہوئے۔ اس نے کہا: مجھے ملک کے ذرائع آمدنی پر مامور کیجیے، میں متدین بھی ہوں اور باخبر بھی۔ اور اِس طرح ہم نے یوسف کو ملک میں اقتدار بخشا، وہ اُس میں جہاں چاہے متمکن ہو۔‘‘ (سورۂ یوسف ۱۲: ۵۴-۵۶)

ان آیات سے پتا چلتا ہے کہ وہ مصری حکومت کے ملازم نہیں، بلکہ مصر کے با اقتدار فرماں روا تھے۔